فتاویٰ منصوریہ
جلد اول
فقیہہ العصر حضرت علامہ الحاج
مفتی عبدالرسول منصور الازہری
چیئرمین شرعی کونسل برطانیہ
مکتبہ مصباح القرآن
مسعود ٹاؤن عارف روڈ ساہیوال

فتاویٰ منصوریہ

تصنیف

فقیہ العصر، استاذ العلماء، شیخ الحدیث والتفسیر، حضرت علامہ

مولانا الحاج مفتی عبدالرسول منصور الازہری دامت برکاتہم العالیہ

چیئرمین شرعی کونسل برطانیہ

مؤسس ادارہ مصباح القرآن ساہیوال پاکستان

ناشر مکتبہ مصباح القرآن عارف روڈ مسعود ٹاؤن ساہیوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولای صل وسلم دائما ابدا　　علی حبیبک خیر الخلق کلھم

کتاب ---------- فتاویٰ منصوریہ (جلداول)

مصنف ---------- مبلغ اسلام علامہ مفتی عبدالرسول منصوری الازہری

مرتب ---------- محمد منور نورانی ناظم تعلیمات ادارہ مصباح القرآن ساہیوال

پروف ریڈنگ ------ قاری عبدالمجید مدرس ادارہ مصباح القرآن ساہیوال

سید محسن رضا شاہ، مطلوب حسین شاہ معلمان ادارہ مصباح القرآن

کمپوزنگ ---------- محمد رضوان محمود مصباح القرآن کمپوزنگ سنٹر ساہیوال

باہتمام ---------- قاری الطاف حسین ناظم ادارہ مصباح القرآن ساہیوال

تاریخ اشاعت ------ ستمبر 2004ء بمطابق رجب المرجب 1425ھ

تعداد ---------- ایک ہزار

ہدیہ ----------

ناشر ---------- مکتبہ مصباح القرآن ساہیوال فون 0441-228412

مقامات تحصیل

ادارہ مصباح القرآن

مسعود ٹاؤن عارف روڈ ساہیوال فون، فیکس 0441-228412,221460

☆ 65-GROVE-ST-REDDITCH WORC-S

B98-8DL UK.

TEL.: 01527595007

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

از

علامہ قاری محمد انور قمر نقشبندی

بانی ادارہ انوار القرآن لائی کراس برمنگھم برطانیہ

مفتیء اسلام حضرت مفتی عبدالرسول منصور الازہری زید مجدہٗ کا شمار اہل سنت و جماعت کی ان علمی و فکری شخصیات میں ہوتا ہے جن کے علم و عمل اور تقویٰ و اخلاص سے اسلامیانِ یورپ کو اسلامی عقائد کی درستگی اور دینی طرزِ حیات کی پختگی کے سلسلے میں بھرپور فائدہ پہنچ رہا ہے۔

حضرت قبلہ مفتی اسلام عرصہ بیس سال سے دیارِ غرب میں اپنے علم اور قلم سے دین اسلام کی روشنی اور اخلاق رسول ﷺ کے فیضان کو عام کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں اور پھر برطانوی مسلمانوں کیلئے یہ امر انتہائی مسرت اور قلبی راحت کا باعث ہے کہ آپ اسلامیات کے پانچ سالہ مرتب نصاب کے تحت جامعہ محی الاسلام صدیقیہ برمنگھم میں ۱۲ برطانوی مسلم نوجوانوں کو بلند پایہ اسلامک سکالرز تیار کرنے کیلئے اپنی علمی و فکری توانائی کو صرف کرنے میں انتہائی محنت اور مستعدی سے کام لے رہے ہیں تدریسی ذوق اور قابلیت کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو تالیف وتصنیف کی دولت سے بھی وافر حصہ عطا کر رکھا ہے۔

زیر نظر فتاویٰ منصوریہ بھی اسی سلسلہ کی ایک حسین کڑی ہے اس فتاویٰ میں

آپ نے نظری وفقہی مسائل کو جس احسن انداز اور طرز استدلال سے مزیّن فرما کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے اس سے آپ کے علمی وتحقیقی آفاق کی بلندیوں کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال مغربی دنیا میں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دین مصطفیٰ ﷺ کی بالادستی اور اسکے اصل چہرے کو اجاگر کرنے کے لئے ایسے باعمل اور انقلابی فکر کے حامل علماء اور دانشور حضرات کا وجود از حد ضروری قرار دیا جار ہا ہے۔

راقم الحروف جسے حضرت مفتی اسلام کی طویل رفاقت کا شرف حاصل ہے آپ کی دینی خدمات کی قبولیت اور درازئ عمر کیلئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا گو ہے اللہ رب العزت آپ کا حامی وناصر ہو۔

والسلام

نیاز کیش

محمد انور نقشبندی

بانی وناظم ادارہ انوار القرآن

لائی کراس ٹڈلینڈز برمنگھم برطانیہ

۲۹ اگست 2004ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اھداء وانتساب

غوث دوراں، امیر العارفین، شہباز ولایت، مرشد راہ حق، حضرت خواجہ

پیر غلام محی الدین غزنوی نیروی قدس سرہ العزیز

کے حضور ہدیہ عقیدت

جن کی نگاہ فیض رسا سے طالبان شریعت اور متلاشیان حقیقت کو علم و عمل

کی خیرات میسر آئی۔

دعاجو و نیاز کیش

عبدالرسول منصور الازہری

امیر شرعی کونسل برطانیہ

یکم ستمبر 2004ء

قبر میں آپ کے والدین کریمین کو زندہ کرنے کی روایت

عن عائشة رضی اللّٰه عنها أخبرت ان رسول اللّٰه ﷺ سأل ربّه ان یحیی أبویه فأحیا هما له و آمنا به ثم اماتهما (۱) واللّٰه قادر علی کل شیء ولیس تعجز رحمة وقدرته عن شیء ونبیه علیه السّلام أهل ان یخصه بما شاء من فضله وینعم علیه بما شاء من کرامته صلوات اللّٰه علیه وآله وسلّم

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خبر دیتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ آپ کے والدین کو زندہ فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمادیا وہ آپ پر ایمان لانے کے بعد پھر وصال فرما گئے''

اس کے بعد امام ابوالقاسم سہیلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے کسی شئے سے اسکی رحمت اور قدرت عاجز نہیں اسکے نبی علیہ الصّلوۃ والسّلام استحقاق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے فضل وکرم سے جو چاہے ان سے خاص کردے اور جو کرامت وشرف چاہے اس سے آپ کو ہمکنار کردے

صلی اللّٰه علیه وآله وصحبه وسلّم

امام ابوعبداللہ قرطبی رحمہ اللہ اپنے تذکرہ میں امام ابوبکر الخطیب کی کتاب السابق والاحق اور امام ابوحفص ابن شاہین کی کتاب النّاسخ والمنسوخ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

---

(۱) الروض الانف ابوالقاسم سہیلی متوفی ۵۸۱ھ

فتاوٰی منصوریہ

ایک ایمان افروز تصنیف

(از: صاحبزادہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی)

الحمدللہ کہ اس نے حضرت انسان کو شعور وادراک کی نعمت سے مالا مال کیا ہے۔ تحقیق وتدقیق اور تفتیش واجتہاد وہ اعلیٰ انسانی اوصاف ہیں جو امور زندگی کو سلجھانے اور تمیز حق وباطل کی تفہیم میں اپنا گراں قدر حصہ ڈالتے ہیں۔ دینی ومذہبی معاملات ہوں یا دنیوی امور، علمی موشگافیاں ہوں یا معاشرتی گھتیاں، ان کے مراتب کا تعین اور ان کی کارکردگی کا بے لاگ جائزہ، یہ آسان کام نہیں۔

؎ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

علماء حق کا مرتبہ ہر اعتبار سے فائق ہے کہ وہ علوم متداولہ ودینیہ کی تفہیم کی بہترین راہیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اس پر مستزاد وہ علماء ذی وقار ہیں جو حالات حاضرہ کے تناظر میں انسان کو درپیش معاملات کی اونچ نیچ اور اس کے پیچ وخم سے آگاہ کرتے ہیں اور استفسارات کا قرار واقعی اور شافی جواب دے کر قلوب کو مطمئن، عقائد حقّہ کو مستحکم اور اشکال ومعمات کو آسان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

محترم مفتی عبدالرسول منصور کا شمار مؤخر الذکر علماء میں ہوتا ہے جو ہر اعتبار سے سلف صالحین اور علماء حق کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ فتاویٰ منصوریہ ان کی تحقیقی تصنیف ہے جس میں آپ نے استفساری موضوعات پر کتاب وسنت کی روشنی میں نہایت حکیمانہ لیکن عام فہم پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔

ابواب نبویات اور فقہیات کے مرکزی عنوانات کے تحت آپ نے لاتعداد عنوانات پر قلم اٹھایا ہے اور ان کی تفسیرات وتشریحات نہایت عرق ریزی اور ژرف نگاہی سے کی ہے۔ کم

وبیش مقالات میں سینکڑوں استفسارات کوآسان پیرائے میں تفہیمی لبادہ پہنادیا گیا ہے۔
قاری موضوع کے آخر پر پہنچتا ہے تو اسے قلبی بشاشت (انشراحِ صدر) نصیب ہوتی ہے۔اوراسے راستے کی حقانیت مل جاتی ہے۔زکوٰۃ کے مسائل حضرت خضر علیہ السلام کی حقیقت حقہ ،وحی کا بند ہو جانا،علم اسلام اور صوفیاء کرام کی نظر میں ،قرآن اور سنت کا ربط و ضبط ،رائج ذکر کی شرعی حیثیت ،عصری تقاضوں کے تحت فقہ اسلامی میں تغیر،من رأنی فی المنام فقدرأی الحق ،رؤیت ہلال ،مساجد میں خواتین کی محفل آرائی ،صدقات رسول ،قرآن کا عثمانی رسم الخط ،گیارہویں شریف اوراسکی حقیقت ،اجتہادِرسول ،اسلامی جہاد،اقرأاور ما أنابقاری ٔ ،مقام مصطفیٰ ،خواب میں زیارتِ رسول ،حضرت ابراہیم کے حقیقی والد گرامی ،قبر کی حیثیت ،ایک قرآنی سوال ،جمعہ سے پہلے چار سنتوں کا ثبوت ،وغیرہم جیسے استفساری عنوانات پر نہایت اعتماد،فکری راست بازی اور ایمانی اطمینان سے مالا مال ہوکر حضرت مفتی عبدالرسول منصور صاحب کی توجیہات ،تفسیرات ،تشریحات اور درِامکانات کی بست وکشادفکرانگیز اور ایمان افروز ہیں۔

؎ تو نے بخشی آگہی، امکان کے در کھل گئے۔
نارسائی کو بھی اک امید کا رستہ دیا۔

بلاشبہ فتاوٰی منصوریہ سے امکان کے در کھلتے ہیں اور نارسائی کوامید اور حوصلے کی روشنیاں نصیب ہوتی ہیں اس عہد میں جہاں ایمانیات کا قلعہ معرض خطر میں ہے فتاوٰی منصوریہ کابالاستیعاب مطالعہ سلامتی ٔ ایمان ،تحفظ حقائق حقہ اور عقائد مسلمہ کی تفہیم کیلئے بصیرت افروز ہے۔

(پروفیسر) سید ریاض حسین زیدی
(وفاقی سیرت ایوارڈ یافتہ)

فہرست

باب اوّل

اَلسّلام علیك ایّها النّبی
نماز میں صیغہ خطاب کی حکمت

نماز میں السّلام علیک ایّھا النّبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے متعلق ارشاد فرمائیں

کہ یہ صیغہ غیب سے کیوں وارد نہ ہوا؟ خطاب میں کیا حکمت تھی ؟

حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی

متعلم جامعہ محی الاسلام صدیقیہ برمنگھم

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلام علیک ایھا النّبیّ ورحمۃ اللہ

ان کلمات طیبات پر غور وخوض کے بعد چند فوائد کو ذیل میں بیان کیا

جارہا ہے۔

وما توفیقی الّا باللہ العظیم

(۱) جب نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور یہ فیض آپ کے واسطہ سے ہم تک پہنچا تو ہمیں حکم ملا کہ ہم بھی مستقل طور پر آپ کی عظمت وجلالت اور مرتبہ و شرف کے پیش نظر آپ کا ذکر خیر کریں تاکہ ہمیں بھی آپ کا قرب اور آپ کی محبت نصیب ہو۔

(۲) یاأیھا النبیُّ اس جملے میں آپ کی نبوت کا ذکر ہوا اور اس کے بعد آپ کی رسالت کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ دراصل یہ ترتیب وجودی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ابتداً جو آیہ کریمہ نازل ہوئی وہ اقرأ سے شروع ہورہی ہے جس سے آپ کا نبی ہونا

ثابت ہوتا ہے اور اس کے بعد قُم فأنذر نازل ہوئی جس سے آپ ﷺ کی رسالت ثابت ہو رہی ہے۔

(۳) السلام علیک سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ سے ایک اسم مبارک ہے تو معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم سلام ہو آپ پر یعنی آپ خیرات و برکات سے معمور رہیں اور آفات و بلیات سے محفوظ یا سلام بمعنی سلامت کے اللہ تعالیٰ آپ کو عیوب ونقائص سے سلامت فرمائے اندریں صورت اللھم سلّم علی محمّد کا معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ تو آپ کی امت آپ کی دعوت آپ کے ذکر میں ہر عیب اور ہر نقص سے سلامتی لکھ دے کہ ہر آنے والے زمانے میں آپ کی امت بڑھتی رہے اور لحہ بہ لحہ آپ کا ذکر خیر ترقی پذیر رہے امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں السلام علیک کا معنی ہے سلمت من المکارہ کہ آپ ہر مشقت اور ناپسند چیز سے محفوظ رہیں یا السلام علیک کا معنی ہے انقیاد و فرماں برداری ہو آپ کیلئے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۱)

پھر جو کچھ تم حکم فرمادو اپنے دلوں میں اسے رکاوٹ نہ پائیں اور دل و جان سے مان لیں

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ کے قول پر یہ دعا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ پر سلام فرما رہا ہے۔

(۱) النساء : ۶۵

السّلام پر اَلف ولام

سلام پر اَلف ولام لا کر معرفہ کر دیا گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس سے کونسی تعریف مراد ہے۔

(۱) یہ تعریف عہد تقدیری ہے یعنی وہ سلام جو سابقہ انبیاء وامم پر پیش کیا گیا تھا وہ آپ پر بھی متوجہ ہو رہا ہے۔

(۲) عہد جنسی یعنی سلام کی وہ جنس اور حقیقت جسے ہر کوئی جانتا ہے وہ جس سے صادر ہوتا ہے اور جس پر نازل ہوتا ہے وہ آپ پر بھی نازل ہو۔

(۳) عہد خارجی السلام یہ الف ولام اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ دے رہا ہے **وسلام علی عبادہ الّذین اصطفیٰ**

اللہ تعالیٰ کے ان چنے ہوئے بندوں پر سلام ہو۔

علیک اور بک

السلام علیک سلام اور سلامتی ہو آپ پر اور السلام بک پر معنی یہ ہوگا کہ سلام و سلامتی ہو آپ کے ساتھ علیک اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمر کا قضاء (فیصلہ) کر دیا ہے۔

اور بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کی قضاء اسکے حکم اور ملک کی نشاندہی کرتی ہے اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلامتی کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ جب کہ یہ بات بک کہنے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنی دعا کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا **وسلام علی عبادہ الّذین اصطفی**۔

سلام علیٰ النبیّ

صیغہ غیب سے کیوں نہ وارد ہوا خطاب میں کیا حکمت تھی پہلی بات تو یہ ہے کہ خود شارع علیہ السلام نے اپنے صحابہ کرام کو اس صیغہ کے ساتھ تعلیم دی ہے اور دوسری بات جو شارح مشکوۃ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان کی وہ یہ ہے

کان وجہ مخاطبتہ بذالک الاشارۃ الی ان اللّٰہ یکشف لہ ﷺ عن المصلّین من امّتہ حتی یکون کالحاضر معھم یشھدلھم بأفضل الأعمال ولیکون تذکّر حضور لا سبباً لمزید الخضوع والخشوع ثمّ رأیت الائمّۃ عدّوا من خصائصہ ﷺ انّ اعمال امّتہ تعرض علیہ و یستغفر لھم واستدلّوا بماروا ہ ابن المبارک عن ابن المسیّب لیس من یوم الّاویعرض علی النبیّ ﷺ اعمال امّتہ غدوۃ وعشیّاً ویعرفھم بسیماھم وأعمالھم.

صیغہ خطاب سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے نمازیوں پر آپ کی ذات بابرکات کو حجابات اٹھا کر ظاہر فرما دیتا ہے۔ حتی کہ آپ ان کے ساتھ حاضر ہو کر افضل الاعمال (نماز) کی ان کیلئے گواہی دیتے ہیں نیز آپ کی حاضری اور تشریف فرما ہونے کے احساس سے ان کے خشوع وخضوع میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ہمارے آئمہ کرام نے یہ آپ کا خاصہ شمار کیا ہے کہ آپ کی امت کے اعمال آپ پر پیش کئے جاتے ہیں اور آپ ان کے لیے استغفار کرتے ہیں اس پر یہ روایت بھی ایک بیّن دلیل ہے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ حضرت ابن المسیب سے

راوی ہیں کہ ہر روز آپ پر صبح و شام آپ کی امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور آپ اپنے امتیوں اور ان کے اعمال کو پہچانتے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ کا نظریہ

امام غزالی شافعی رحمہ اللہ اپنی معروف ترین کتاب احیاء العلوم میں السلام علیک ایھا النبیّ سے پہلے فرماتے ہیں احضر شھد الکریم فی قلبک لیصدق أملک فی أنه یبلغه ویردّ علیک ماھو اُوفیٰ منه آپ کی ذات کریم کو اپنے دل میں حاضر جان تا کہ تجھے یقین ہو جائے کہ میرا درود و سلام آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ اپنی شان رحمت کے مطابق مجھے جواب سے نواز رہے ہیں۔

اھل عرفان کا نظریہ

أنّ المصلّین لما استفتحوا باب الملک بالتحیات أذن لھم فی حریم الحی الذی لایموت فقرّت أعینھم بالمناجاة فنبّھوا علیٰ أنّ ذالک بسبب المصطفیٰ وبرکة متابعته فالتفتوا فاذا الحبیب فی حریم الحبیب حاضر فاقبلوا علیه قائلین السّلام علیک ایّھاالنبیّ ورحمة اللّٰه وبرکاته

جب نمازیوں نے بادشاہ حقیقی جلّ مجدہ کے دروازے پر التحیّات للّٰه والصّلوات کہتے ہوئے دستک دی تو انہیں حی وقیّوم کی بارگاہ اقدس میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی تو اس مناجات و مکالمے سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں تو ساتھ ہی انہیں اس بات سے مطلع کیا گیا کہ یہ اعزاز انعام مصطفیٰ کریم اور انکی متابعت و

پیروی کے طفیل ہے۔ معاً انہوں نے دیکھا تو حبیب ﷺ حبیب کی بارگاہ عالی میں حاضر اور جلوہ فرماتھے۔ تو انہوں نے جمال جہاں آرا پر نظر مرکوز کرتے ہوئے کہا السّلام علیک ایّھا النبیّ ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

عظیم عارف شیخ ابوبکر ورّاق رحمہ اللہ کا موقف۔

قال الولی بالاتّفاق ذات یوم لاھل مجلسہ الرماق یاایھاالنّاس ابشروا بالبشارۃ العظمیٰ والکرامۃ الکبریٰ ھی انہ ﷺ لاینساکم فی حال من الاحوال ولا فی مقام من مقامات الاکرام والاجلال اذ لو کان ینساکم ساعۃ او لحظۃ نسیتم فی مقام الھیبۃ حین قام بین یدی ربّ العزّۃ فقال التّحیات للّٰہ....

قال الرّب سبحانہ' السّلام علیک ایّھا النبیّ الثلاث بالثلاث طباقا جزاءً وفاقا فقال النبیّ ﷺ اعتناءً بکم السّلام علینا (۱)

مسلّم ولی حضرت ابوبکر ورّاق رحمہ اللہ نے ایک روز اپنی مجلس میں حاضر مریدین سے کہا اے لوگوں تمہیں بڑی بشارت اور عمدہ کرامت مبارک ہو وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کسی حال میں اور کسی بھی عزّت وجلال والے مقام پر تم کو بھولے نہیں اگر آپ نے ایک لمحہ کیلئے بھی تمہیں بھولنا ہوتا تو جب آپ مقام ھیبت وجلال میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر تھے تو اس وقت بھول جاتے آپ نے عرض کیا تمام قولی بدنی اور مالی عبادتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا سلام ہو تجھ پر اے نبی تین کے

---

(۱) الفتوحات الربانیہ علی الاذکار النواویہ : محمد بن علان الصدیقی ج ۲ ص ۲۲۱

بدلے اللہ تعالیٰ نے بھی تین کامل جزا کے طور پر انعامات سے مالا مال کیا تو آپ نے اس وقت تم پر شفقت کرتے ہوئے فرمایا السّلام علینا ہم سب پر سلام ہو۔

وصلی اللّٰہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم

عظیم فلسفی اور مفکّر علاّمہ ایوب دھلوی مرحوم کا نظریہ

جب بندہ سجدے میں گر گیا تو ہوا کی گھاٹی جو سب سے زیادہ مہلک ہے سے نکل گیا ہوا کسے کہتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ (۱)

''بھلا تو نے دیکھا جس شخص نے اپنی ہوا کو اپنا معبود بنا رکھا ہے''

یعنی قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے مقابل اپنی رائے کو ظاہر کرنا ہی دراصل ہوا ہے نماز میں قیام رکوع اور سجود یہ تین ارکان تین مہلک ترین گھاٹیاں شہوت، غضب، اور ہوا سے نکال دیتے ہیں اس کے بعد بندہ پریشانی اور گھبراہٹ سے نکل کر امن وسکون میں آگیا اب اسے حکم ہوا کہ تو دربار الٰہی میں بیٹھنے کے قابل ہے۔ آؤ اور ہماری محفل میں بیٹھ جاؤ جب اسے دربار ایزدی میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی تو یہی بندۂ مومن کی معراج ہے کہ وہ اپنے مولیٰ اور خالق کے حضور حاضر ہے اس نے دربار خداوندی میں بیٹھنے کے بعد اس وحدہٗ لاشریک خدا کی تعریف شروع کردی، التّحیات للّٰہ والصّلوٰت والطّیبات تو ادھر سے روح محمد ﷺ کا نزول ہوا اور اس کا عروج نقطۂ کمال کو پہنچ گیا جب دونوں ایک ہی مقام پر مل گئے نمازی

---

(۱) الجاثیہ : ۲۳

اور نبی ﷺ تو نمازی نے شرف زیارت پاتے ہی کہا السّلام علیک ایھا النبیّ ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ اگر آپ قاعدے اور ضابطے سے نماز پڑھیں تو یہ منظر آپ کو آنکھوں سے نظر آئے گا بہر حال جب امتی نے نبی ﷺ سے ملاقات ہونے پر سلام عرض کیا تو آپ نے جواب میں وعلیک السلام نہیں فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا السّلام علینا وعلی عباد اللّٰہ الصالحین ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام صالح بندوں پر سلام ہو کیونکہ آپ تو رحمة اللعالمین ہیں کہ معراج میں آنے والے سلامتی صرف تجھ پر ہی نہیں بلکہ ہم سب پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام صالح بندوں پر تو تقرب کی اس انتہائی بلندی کو دیکھ کر ملائکہ کو حیرت ہوئی تو انہوں نے اس بندے سے پوچھا آخر یہ عروج تجھے کس طرح نصیب ہوا تو اس نے کہا

" أشهد أن لااله الاا للّٰه وأشهد انّ محمدًا عبده' ورسوله' "

میرا یہ عروج وارتقاء نبی کریم ﷺ کی خیرات وبرکات ہے تو فرشتوں نے کہا جب اتنی بڑی معراج تجھے نبی کریم ﷺ کے طفیل ملی ہے تو تو نے ان کی خدمت میں کیا تحفہ اور نذرانہ پیش کیا تو اس نے کہا

اَللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلّیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم.

میں نے آپ کے حضور درود شریف کا ھدیہ پیش کیا ہے یہ حال دیکھ کر ملائکہ میں شور مچا اور وہ جوق در جوق اسکے ظاہری جسم کی زیارت کیلئے نازل ہوئے جونہی ملائکہ کا نزول ہوا اور وہ اسکی زیارت کرنے لگے تو اس نے دائیں طرف دیکھ کر کہا السّلام علیکم ورحمة اللّٰہ اور بائیں طرف دیکھ کر کہا السّلام علیکم

ورحمة اللّٰه(۱)

یہ ہے وہ نماز جس کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o (۲)

عبدالرسول منصور الازہری

ریڈنگ برطانیہ

13 اپریل 2004ء

(۱) تفسیر ابو بلی ص ۲۱۹ ج ۳ طبع مکتبہ رازی کراچی (۲) المومنون : ۱

عالم برزخ میں
رسول اللہ ﷺ سے
باران رحمت کی درخواست
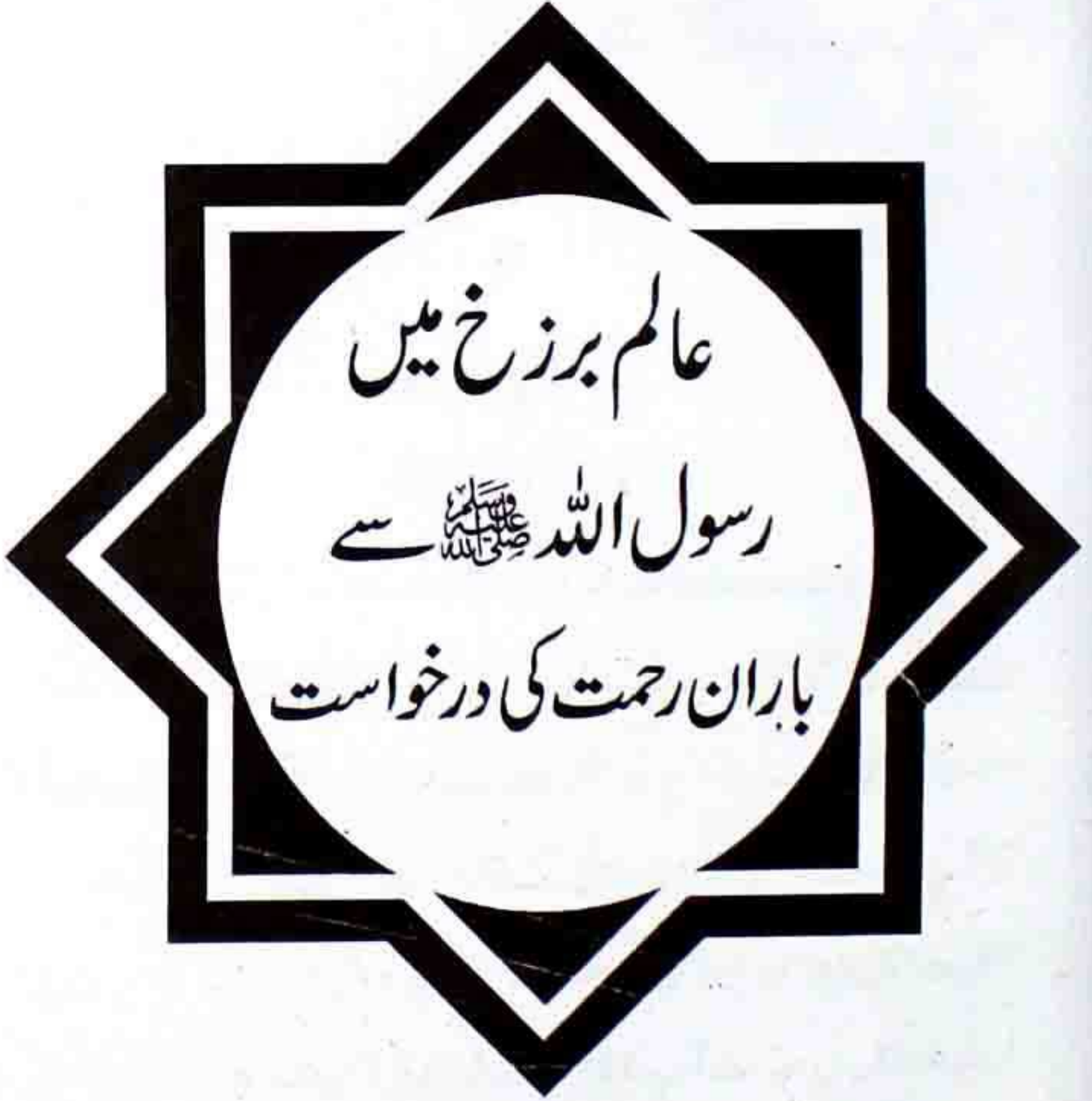
کیا یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال شریف کے بعد ایک صحابی نے روضہ اطہر پر حاضر ہو کر آپ ﷺ سے باران رحمت کی درخواست کی جبکہ بعض لوگ اس حدیث کو صحیح قرار نہیں دیتے۔

سید محسن رضا شاہ

متعلم ادارہ مصباح القرآن ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ بات حدیث مالک الدّار سے ثابت ہے کہ جس میں حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ نے عہد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ میں نبی کریم ﷺ سے استسقاءً (بارش طلب کرنا) کیا تھا حضرت مالک الدّار جن کا اصل نام مالک بن عیاض تھا آپ حضرت عمر کے غلام اور ان کے خازن تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کو مال و اسباب تقسیم کرنے پر مقرر فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ کا نام مالک الدّار ہی معروف ہو گیا طبقات ابن سعد الاصابہ اور معارف ابن قتیبہ میں مرقوم ہے کہ ومن موالی عمر بن الخطّاب مالک الدّار وکان عمر ولّاہ دارًا وکان یقسم بین النّاس فیما شیئًا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلاموں سے مالک الدّار بھی شامل ہیں جنہیں حضرت عمر نے ایک گھر کا مختار بنایا تھا جس میں آپ لوگوں میں مال تقسیم کیا کرتے تھے) آپ کی

روایت کردہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

أصاب النّاس قحط فی زمان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ فجاء رجل الی قبر النّبیّ ﷺ فقال یارسول اللّٰہ استسق اللّٰہ لأمّتک فانھم قد ھلکو فأتاہ رسول اللّٰہ ﷺ فی المنام فقال ائت عمر فأقرأہ السّلام فأخبرہ أنّھم یسقون (۱)

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قحط سالی پیدا ہوئی تو ایک شخص نبی کریم ﷺ کی قبر انور پر حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے باران رحمت طلب کریں کیونکہ وہ ہلاک ہورہے ہیں تو نبی کریم ﷺ اسکے خواب میں تشریف لائے اور اس سے فرمایا کہ عمر کے پاس جاؤ اسے سلام کہو اور اس کو بتادو کہ لوگوں کو باران رحمت عطا کردی جائے گی''

اس حدیث سے ثابت ہورہا ہے کہ آپ ﷺ سے حالت برزخ میں استسقاءً کرنا اور آپ کا رب تعالیٰ سے دعا کرنا اور آپ کا ہر سوال کرنے والے کے سوال کا علم رکھنا ایک بیّن حقیقت ہے۔ نیز یہ ایک ایسا فعل تھا کہ کسی صحابی نے بھی اس پر انکار نہیں کیا اس حدیث کو امام بخاری شافعی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تاریخ میں ابو صالح ذکوان سے نقل کیا ہے۔ (۲)

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خواب میں یہ منظر اور جواب پانے والے صحابی حضرت بلال بن الحارث تھے رضی اللہ عنہ **وھذا نصّ علی عمل الصحابہ**

---

(۱) بیہقی، مقالات کوثری ص ۳۸۹ مطبعہ الانوار قاہرہ

(۲) تاریخ بخاری، اصابہ، ابن ابوخیثمہ، ابن ابوشیبہ، فتح الباری ابن حجر ج ۲/۳۳۸

فی الاستسقاء به ﷺ بعد وفاته حيث لم ينكر عليه احد منهم مع بلوغ الخبر اليهم وما يرفع الى امير المومنين يذيع ويشيع (۱)

آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ آپ کے وصال شریف کے بعد استسقاء کرنے کے سلسلے میں عمل صحابہ پر یہ ایک قطعی دلیل ہے بایں طور کہ یہ خبر صحابہ بلکہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچی اور کسی صحابی نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔

شیخ ابن تیمیہ کا حکایت ابو جعفر منصور سے انکار

اس خبر کی صحت کے ثبوت کیلئے پہلے حدیث عمر رضی اللہ عنہ کو ذکر کیا جا رہا ہے

عن النبيّ ﷺ لمّا اقترف آدم الخطئية قال يا ربّ أسئلک بحق محمّد لما غفرت لى (۲)

"جب حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے لغزش ہوئی تو انہوں نے عرض کیا اے میرے رب میں تجھ سے محمد ﷺ کے طفیل سوال کرتا ہوں تو مجھے معاف کردے"۔

اس حدیث کو امام حاکم نیشاپوری نے المستدرک میں نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ **هٰذا حديث صحيح الاسناد وهو أوّل حديث ذكرته لعبد الرّحمٰن بن زيد** "یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور یہ وہ پہلی حدیث ہے جسے میں نے عبدالرحمان بن زید کے حوالے سے نقل کیا ہے"۔

امام طبرانی نے اسے الاوسط اور الصغیر میں بھی اسے نقل کیا ہے اس کی سند

---

(۱) مقالات کوثری ص ۳۸۹ (۲) المستدرک حاکم نیشاپوری

میں کچھ ایسے راوی ہیں جنہیں امام ھیثمی مکی نہیں پہچانتے اور عبدالرحمان بن زید کو امام مالک نے ضعیف کہا ہے۔

کچھ دیگر محدثین نے بھی آپ کے ساتھ موافقت ومتابعت کی ہے تاہم اس پر کذب کی تہمت عائد نہیں کی بلکہ صرف وہم کا قول کیا ہے اندریں حالت ایسے راوی کی بعض احادیث کو قبول کیا جاتا ہے۔

اسی بنا پر امام حاکم نے اس حدیث کو قبول کرتے ہوئے صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔ نیز امام حاکم سے پہلے امام مالک رضی اللہ عنہ بھی اسے قبول فرما چکے ہیں۔ کیونکہ امام مالک سے محمد بن حمید نے روایت کی ہے کہ آپ نے عباسی خلیفہ اَبوجعفر منصور سے فرمایا تھا۔

هو وسيلتك ووسيلة أبيك آدم عليه السّلام

''یہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرا اور تیرے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا وسیلہ ہیں''

جب امام مالک رضی اللہ نے اس حدیث کو تسلیم کرنے اور اس سے استدلال کر کے یہ قول کیا تو عبدالرحمان بن زید سے وہم اور قلّت ضبط کی تہمت بھی زائل ہوگئی بہر حال عبدالرحمان بن زید ان راویوں سے نہیں جن کی روایت کو مطلقاً رد کر دیا جاتا ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ کا موقف

حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ جو دینی وفکری میدان میں ایک عظیم مجتہد کے طور سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی معروف کتاب الامّ اور المسند میں بھی اس حدیث

کے صحیح ہونے پر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔علاّمہ کوثری فرماتے ہیں

فلالوم علی الحاکم فی عدّة هٰذا الحدیث صحیحا بل هو الصحیح الّا عند من یضیق صدره عند سماع فضائل المصطفیٰ ﷺ

اس حدیث کو صحیح قرار دینے میں امام حاکم پر کوئی طعن و ملامت نہیں بلکہ یہ ہے ہی صحیح البتہ اس شخص کے نزدیک غیر صحیح ہے جس کا سینہ فضائل رسول ﷺ کے سننے سے تنگ ہو رہا ہے پھر امام مالک کی ابو جعفر منصور سے اس بات کو قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ نے اپنی معروف کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفی میں بھی جید اور مضبوط سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اس قول کے راوی ابن حمید سے مراد محمد بن حمید الرازی ہیں ابن حمید الرازی کے متعلق امام ابن تیمیہ کے شاگرد ابن عبدالھادی نے جو تبصرہ وتنقید کی ہے وہ اس کی شان وحال کے مطابق دکھائی نہیں دیتی اس نے رازی کے متعلق تنقیدی اقوال تو جمع کردیئے مگر اہل علم اور رجال فن نے اس کے بارے جو کلمات خیر کہے ہیں وہ تمام تر متروک کردیئے یہ کہاں کی علمی دیانت ہے ایک نقاد کیلئے ضروری ہے کہ وہ جرح کے ساتھ تعدیل کا بھی ذکر کرے۔ محمد بن حمید وہ راوی ہے جس سے امام ابو داؤد امام ترمذی امام ابن ماجہ امام احمد بن حنبل اور امام یحیٰی بن معین نے بھی روایت کی ہے امام ابن ابی خیثمہ کا قول ہے کہ جب ابن معین سے ان کے بارے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ثقة لابأس به رازی کیس ''رازی ثقہ اور دانا ہے اس سے روایت کرنے میں کوئی ڈر نہیں''۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے لایزال بالری علم مادام

محمد بن حمید جب تک رای میں محمد بن حمید موجود ہے وہاں علم رہے گا۔

امام صاغانی اور ذھلی نے بھی ان کی ثناء جمیل کی ہے امام الخلیل نے الارشاد میں کہا ہے کہ ان کے عالم و فاضل ہونے میں شک نہیں کہ امام احمد اور یحیٰ نے انہیں پسند کیا ہے۔ بہر حال ایسے راوی پر اس خبر میں کوئی اتہام و الزام نہیں لگایا جا سکتا ابن حمید رازی نے ۲۴۸ھ میں انتقال فرمایا امام مالک رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۵ برس تھی۔ حنبلی حضرات اپنے امام کی المسند میں ۱۵ برس کے راوی کی روایت کو قبول بھی کرتے ہیں۔

اس خبر کے دوسرے راوی یعقوب بن اسحاق ہیں ان کے متعلق بھی خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ لا بأس به اس کی روایت میں کوئی حرج اور خوف نہیں۔ تیسرے راوی ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن المنتاب ہیں قاضی اسماعیل رحمہ اللہ کے اُجل اُصحاب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۳۰۰ھ کے قریب خلیفہ المقتدر نے ان کو مدینہ منورہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اس عہد میں مدینہ منورہ کے عہدہ قضاء پر ثقہ اہل علم کو ہی فائز کیا جاتا تھا۔ چوتھے راوی محمد بن احمد بن الفرج ہیں انہیں امام السمعانی نے الانساب اور امام ابن اثیر نے اللّباب میں ثقہ قرار دیا ہے۔ اور ابوالحسن الفہدی نے بھی انہیں ثقات میں شمار کیا ہے۔ (۱)

عبدالرسول منصور الازہری

15 مئی 2004ء

---

(۱) مقالات کوثری رحمہ اللہ متوفی ۱۳۷۱ھ

من رآنی فی المنام
فقد رأى الحق

خواب میں زیارت رسول ﷺ کی شرعی حیثیت بیان کرتے ہوئے

"من رأنی فی المنام فقد رأنی فان الشیطان لایتمثل بی "

کی وضاحت فرمائیں نیز کیا آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی آپکی حیات وممات میں

عام ہے یا آپ کی ظاہری حیات کے ساتھ ہی خاص ہے۔؟

والسلام

صوفی غلام دستگیر شاہ

آستانہ عالیہ چک **110/7.R** چیچہ وطنی

الجواب

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

من رأنی فی المنام فقد رأنی فاِنّ الشّیطان لا یتمثّل بی

خواب میں زیارت رسول ﷺ سے متعلق چار طرح کے الفاظ وارد ہوئے ہیں **من رأنی فقد رأی الحق** جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو یقیناً اس نے حق کو دیکھا **فسیرانی فی الیقظة** وہ عنقریب مجھے بیداری کی حالت میں بھی دیکھے گا **فکأنّما رأنی فی الیقظة** تو گویا اس نے مجھے بیداری میں دیکھا **فاِنّه لا ینبغی للشّیطان أن یتشبّه بی** کیونکہ شیطان کو یہ طاقت نہیں کہ وہ میری شکل وصورت میں آسکے

محدّثین کرام اور معنیٔ حدیث

علامہ قاضی اُبوبکر بن الطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **فقد رأنی** کا معنی یہ ہے کہ اس شخص نے حقیقۃً مجھے دیکھا یعنی اس کا یہ خواب بے معنی نہیں ہے **فان الشیطان لا یتمثّل بی** کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کہ یہ خواب صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے اور اس میں شیطانی عمل کا شائبہ تک نہیں بعض اہل علم نے اس حدیث کو اس کے ظاہر پر رکھتے ہوئے یہ معنی کیا ہے کہ جس نے آپ کو خواب میں دیکھا اسے آپ کا ادراک نصیب ہوا وہ فرماتے ہیں کہ ادراک کے لئے قربِ مسافت آنکھوں سے احاطہ یا مرئی (دیکھے ہوئے) انسان کا زمین میں دفن یا اس پر ظاہر ہونا شرط نہیں بلکہ اس کا صرف موجود ہونا ہی کافی ہے جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کا جسم مبارک باقی اور دائم ہے کہ زمین انبیاء کرام کے اجساد طیّبہ کو تبدیل و تغیّر نہیں کرسکتی۔

قاضی عیاض مالکی اور امام اُبوبکر بن العربی کا قول یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ ﷺ کو آپ کی صفت معلومہ معروفہ سے دیکھا تو یہ ادراک حقیقت ہے اور اگر صفت معلومہ سے ہٹ کر دیکھا تو یہ ادراکِ مثال ہوگا۔

امام غزالی اور معنیٔ حدیث

فقد رأنی کا معنی ہے کہ اس نے حقیقۃً میری مثال کو دیکھا کیونکہ خواب میں جسے دیکھا گیا ہے وہ آپ کی مثال ہے یہی بات امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس کا یہ معنی نہیں کہ اس نے میرے جسم اور بدن کو دیکھا بلکہ اس نے میری مثال کو دیکھا وہ مثال ایک ایسا آلہ یا واسطہ ہوگی جس کے ساتھ وہ معنی ادا ہو جائے گا جو

میری ذات کو اس کی طرف تعبیر کرے گا بلکہ بدن بھی بیداری کے عالم میں نفس وذات تک لے جانے کا ایک آلہ ہی تو ہے تو حق بات یہ ہے کہ خواب میں رائی (دیکھنے والا) آپ کے روئے مقدس جو محّل نبوت ہے کی مثال دیکھتا ہے خواب میں اسے جو شکل دکھائی دیتی ہے وہ روح نبی ﷺ ہے اور نہ ہی آپ کا سراپا مبارک بلکہ وہ آپ کی مثال ہوا کرتی ہے۔

امام محدّث بدرالدین عینی اور معنی حدیث

علامہ بدرالدین محمود عینی مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خواب کی تین قسمیں ہیں

رؤیا من اللہ رؤیا من الشیطان اور رؤیا ماحدّث بہ المرء نفسہ

خدا کی طرف سے شیطان کی طرف سے اور انسان کے اپنے نفس کی طرف سے

حدیث مبارکہ نے دوسری قسم کی نفی تو کر دی تو کیا نبی کریم ﷺ کی خواب میں زیارت تیسری قسم یعنی انسان کا نفس اس کا سبب بننے سے ممکن ہو سکتی ہے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ایک مقدّمہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ دو اشخاص کے درمیان بیداری میں اجتماع اور خواب کی دنیا میں حصول اتحاد کے لئے پانچ اصول وضع ہوئے ہیں اشتراک فی الذّات اشتراک فی صفۃ فصاعداً او فی حال فصاعداً او فی الافعال أو فی المراتب ان دونوں کی ذات میں اشتراک ہو یا ان کی ایک یا زائد صفات میں یا ایک حال یا زائد احوال یا ان کے افعال یا مراتب میں اشتراک پایا جاتا ہو چنانچہ جب بھی دو یا دو سے زائد اشیاء کے درمیان مناسبت اور مشابہت تصور ہوگی وہ ان پانچ اصولوں سے ہٹ کر نہیں پائی جائے گی پھر یہ مناسبت

جتنی قوی یا ضعیف ہوگی دو اشیاء کے درمیان اجتماع کی قلّت و کثرت اسی کیفیت سے ہوگی جس شخص کو یہ پانچوں اصول حاصل ہو جائیں گے اسے گذرے ہوئے اسلاف و اشخاص کی ارواح کے ساتھ انتہائی گہری اور قوی مناسب پیدا ہو جائے گی وہ جب چاہے گا ان کے ساتھ اجتماع کرے گا اس مقدّمہ کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ خواب انسان کو اس کے نفس کی طرف سے ہونا ممکن ہے کیونکہ اس کے اور نبی کریم ﷺ کے درمیان کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی جو ان کے اجتماع کا سبب بنے۔(۱)

سیّد انور شاہ کشمیری اور معنیٔ حدیث

فیض الباری شرح بخاری میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ اس حدیث مبارک کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حقیقت حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے مگر مرئی جسے عالم رؤیا میں دیکھا گیا ہے وہ کبھی تو اس صورت مبارکہ کی مثال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئی ایک صورت ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ آپ کی صورت اور روحانیت پر حقیقۃً پیدا فرما کر ہمیں دکھا دیتا ہے اور ہمارے نفس میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ یہ آپ کی ہی صورت ہم سے مخاطب ہو رہی ہے اور کبھی آپ کی روح مبارک از خود مثالی وجود کے ساتھ دکھائی دیتی ہے بیداری کی حالت میں اور کبھی نیند کی حالت میں جیسا کہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کے متعلق بھی منقول ہے (۲) کہ انہوں نے آپ ﷺ کو ۲۲ مرتبہ دیکھا بہر حال رؤیت و زیارت کبھی تو خود نبی کریم ﷺ کی

---

(۱) عمدۃ القاری علامہ عینی مصری (۲) فیض الباری سید کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ

طرف سے عنایت وعطیہ کے طور پر ہوتی ہے اور یہ رؤیت وزیارت کا بلند ترین درجہ ہے اور کبھی آپ کے جسد اطہر کی مثال کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ دونوں صورتیں اس حدیث مبارک کے معنی ومفہوم میں داخل ہیں (۱)

امام شاطبی کے نزدیک معنیٔ حدیث

من رأنی فی النوم فقد رأنی حدیث مبارک کے معنی ومفہوم پر بحث کرتے ہوئے امام أبواسحاق شاطبی فرماتے ہیں کہ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ ایک حاکم کی عدالت میں کسی مقدمہ کے سلسلہ میں دو عادل اور معتبر گواہوں نے گواہی پیش کی مگر جب وہ سویا تو اس نے نبی کریم ﷺ کی زیارت کی آپ نے اسے حکم فرمایا کہ اس گواہی پر فیصلہ نہ دینا کیونکہ یہ گواہی جھوٹی اور باطل ہے امام ابن رشد رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ حاکم کے لئے حلال نہیں کہ وہ اس گواہی پر فیصلہ نہ دے کیونکہ ایسے خواب سے احکام شریعت کا بطلان نظر آتا ہے یہ قطعاً باطل ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا بھی صحیح نہیں کیونکہ ایسے معاملے پر غیب کا علم صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہی رکھتے ہیں جن کا خواب بھی وحی ہوا کرتا ہے ان کے علاوہ باقی لوگوں کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ من رأنی فقد رأنی حقا کا معنی یہ نہیں کہ جس نے آپ کو خواب میں دیکھا اس نے آپ ہی کو حقیقۃً دیکھا کیونکہ دیکھنے والا آپ کو کئی بار مختلف صورتوں میں دیکھتا ہے یونہی ایک شخص آپ کو

---

(۱) تنویر الحلک علامہ سیوطی مصری

کسی ایک صورت وصفت پر دیکھتا ہے اور دوسرا آپ کو کسی دوسری شکل وصورت پر دیکھتا ہے جبکہ آپ کی صورت مبارکہ اور صفات میں اختلاف ہے ہی نہیں بلکہ حدیث مبارک کا معنی یہ ہے کہ جس نے مجھے میری اس صورت پر دیکھا جس پر مجھے پیدا کیا گیا ہے تو اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل وصورت میں متمثل نہیں ہوسکتا اب یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے کہ دیکھنے والے نے آپ کو جس صورت پر دیکھا وہ بعینہ آپ ہی کی صورت تھی علامہ ابن رشد کی اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرئی جس ذات کو دیکھا گیا ہے کبھی غیر نبی ہوتا ہے اگرچہ دیکھنے والے کا اعتقاد ہو کہ اس نے آپ ﷺ کو ہی دیکھا ہے (۱)

علامہ صنعانی اور معنیٔ حدیث

علامہ محدث صنعانی رحمہ اللہ من رآنی فی المنام کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے آپ ﷺ کے دور کے لوگ مراد ہیں آپ کا مطلب یہ تھا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اور اس نے ہجرت نہ کی تو اللہ تعالیٰ اسے ہجرت بھی نصیب کرے گا اور بیداری کے عالم میں میری زیارت سے بھی مشرف ہوگا ایک دوسرا قول یہ بھی ہے کہ لیقظۃ بیداری سے مراد دار آخرت کی بیداری ہے جیسا کہ آپ ﷺ کا قول مبارک ہے الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہو جائیں گے تو دار آخرت آپ کی رؤیت سے آپ کے قرب

---

(۱) الاعتصام ۱ / ۳۵۱ تیسیر الفقہ علامہ قرضاوی ص ۱۹۵

خاص کے ساتھ زیارت بھی مراد لی جاسکتی ہے(۱)

خلاصۂ کلام

حدیث مبارک سے ثابت ہوا کی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خاصہ اور شرف عطا کیا ہے کہ امت کا آپ کو خواب میں دیکھنا حقیقت وصداقت پر مبنی ہے اور شیطان کو یہ طاقت وہمت نہیں دی گئی کہ وہ آپ کی خلقت وصورت میں آکر خواب کی حالت میں اپنی زبان سے کذب بیانی کرے تو جیسے معجزہ انبیا کرام کے لئے خرق عادت ہے ایسے ہی شیطان کا عالم بیداری میں آپ کی صورت میں متمثّل ہوکر آنا بھی محال وناممکن ہے پھر حدیث بخاری ۸۷ ۲ میں وارد ہونے والا یہ ارشاد رسول اللہ ﷺ کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری کی حالت میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت میں نہیں آسکے گا یہ آپ کی حیات وممات میں عام ہے یا آپ کی ظاہری حیات کے ساتھ ہی خاص ہے ظاہر ہے کہ حدیث کے الفاظ اس حکم کی عمومیّت پر دلالت کرتے ہیں آپ ﷺ کی طرف سے اس پر کوئی تخصیص وارد نہیں ہوئی جو حضرات اس کی عمومیّت کے قائل نہیں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ حکم اور بشارت آپ کی ظاہری حیات کے ساتھ ہی خاص تھی آپ کے وصال شریف کے بعد اب آپ کی رؤیت اور زیارت نہیں ہوسکتی ایسے حضرات اس قادر مطلق خدا کی قدرت سے جہالت اور اس کی تعجیز (عاجز سمجھنا) کے مرتکب ہوئے ہیں کیا انہوں نے سورہ بقرہ میں اس

---

(۱) مبارق الانوار شرح مشارق الانوار ج ۱ ص ۱۰۷ علامہ صنعانی

بقرہ کا قصہ نہیں پڑھا ارشاد باری تعالیٰ ہے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى تم اس مقتول کو اس گائے کا کچھ حصہ مارو تو وہ زندہ ہو جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ مردے زندہ کرے گا جب اس میت کی قبر یا خود اس میت پر گائے کا کچھ حصہ مارا گیا تو وہ زندہ ہو کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق سب کچھ بتا دیا اہل علم کی تحقیق کے مطابق اس شخص کے قتل کے چالیس سال بعد یہ واقعہ رونما ہوا کیونکہ بنی اسرائیل کو ایسی گائے کی تلاش میں چالیس سال صرف ہوئے تھے اسی سورہ بقرہ میں حضرت عزیر اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کا قصہ بھی مذکور ہے تو وہ قادر مطلق جل شانہ جس نے گائے کے حصے کو میت پر مارنے کے بعد مقتول کی زندگی کا سبب بنا دیا حضرت عزیر کے تعجب کو ۱۰۰ سال بعد ان کی اور ان کے گدھے کی زندگی کا باعث کر دیا تو وہ اس امر پر بھی قادر ہے کہ وہ آپ ﷺ کی خواب میں رویت کو آپ کی بیداری میں رویت اور زیارت کے لئے سبب قرار دے دے

وماذالک علی اللہ بعزیز

چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تو انہیں آپ کا یہ فرمان کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری کی حالت میں بھی دیکھے گا یاد آ گیا تو اس سلسلے میں متفکر ہوئے اسی اثنا میں آپ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس فرمان کے متعلق عرض کیا تو آپ نے نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک اور آئینہ نکال کر فرمایا یہ ہے آپ کا جبہ اور یہ ہے آپ کا آئینہ جب میں نے آئینہ میں دیکھا تو مجھے اپنی صورت کی بجائے رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارک نظر آئی اس لئے

یہ عنایت وبشارت آپ کے وصال کے بعد بھی جاری ہے(۱)

خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امتی کے خواب میں آ کر کسی شئی کے بارے میں حکم دینا یا منع کرنا کسی فرد یا جماعت سے محبت یا اس سے نفرت وعداوت کا اظہار کرنا اس سے کسی شرعی حکم کے وجوب یا استحباب تحریم یا کراہت و جواز ثابت نہیں ہوتا البتہ خواب میں آنے والے ایسے امور کو شریعت مطہرہ معصومہ پر پیش کیا جائے گا اگر وہ امور شریعت کے موافق ہوں گے تو فبھا اندریں صورت شریعت نبویہ ہی حجّت وسند قرار پائے گی اور خواب محض تانیس وتبشیر کے لئے ہوگا بصورت دیگر ایسے حکم کو مسترد کر دیا جائے گا کیونکہ جس چیز پر اعتقاد اور اس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے وہ شریعت ہی ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کی ظاہری حیات میں وحی کے ذریعے نازل کیا گیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اب خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے دوران آنے والا کوئی شرعی حکم ہمارے لئے حجّت اور سند نہیں رہا کیونکہ دین کی تکمیل اور اتمام نعمت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے حضور واپس بلایا ہے(۲)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض اہل علم نے

(۱) تنویر الحلک علامہ جلال الدین سیوطی (۲) تیسیر الفقہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی ص ۱۸۸

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ دن کے وقت روزہ دار کو بوسہ لینا منع ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ نے مجھ پر نظر کرم نہ کی تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھ سے کیا قصور ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تو روزہ کی حالت میں بوسہ نہیں لیتا میں نے عرض کیا مجھے قسم ہے اس ذات والاصفات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے اب میں روزہ کی حالت میں بوسہ نہ لوں گا۔ اس خبر پر ابن حزم تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ الشرائع لا توخذ بالمنامات (۱)

شرعی احکام خوابوں سے ثابت نہیں ہوتے خصوصًا اس مسئلہ پر تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیداری اور ظاہری حیات مبارکہ میں روزہ کی حالت میں بوسہ لینے کی اجازت دی تھی تو اب اپنے وصال شریف کے بعد اسے منسوخ کردیں عقل ونقل کے خلاف ہے۔ (۲)

پھر اس مسئلہ پر وارد ہونے والے آپ کے اقوال مبارک من رانی فی المنام فقد رأنی فان الشیطان لا یتمثّل بی : من رأنی فقد رأی الحق فاّن الشّیطان لا یتلوّننی : انّ الشّیطان لایترأی بی لا یتمثّل فی صورتی : انه لا ینبغی للشّیطان ان یتمثّل بی (۳)

---

(۱) المحلّی ۶/۵۰۷: ابن حزم (۲) ابوداؤد رقم حدیث ۲۳۸۵ صحیح ابن خزیمہ 1999: ابن حبان ۹۰۵: مستدرک حاکم ۱/۴۳۱ (۳) صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابن ماجہ

کا معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ اور آپ کی امت پر یہ انعام واکرام فرمایا ہے کہ شیطان کو یہ ہمّت وطاقت نہیں کہ وہ خواب کی حالت میں آپ کی صورت مبارکہ میں ظاہر ہو کر کذب بیانی کر کے آپ کی امت کو گمراہ کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ہر شکل میں متشکّل ہونے کی قدرت وطاقت دے رکھی ہے۔ مگر اسے اپنے نبی ﷺ کی صورت میں متمثّل ہونے کی قطعاً طاقت نہیں بخشی تو جو شخص آپ ﷺ کو خواب میں دیکھے گا وہ یقیناً آپ کو ہی دیکھے گا اس کا وہ خواب معنی وحقیقت پر مبنی ہوگا اور شیطانی وسوسے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ تعبیر رؤیا کے امام محمد بن سیرین مصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی معنی مراد لیا ہے۔(۱)

عبدالرسول منصور الازہری

ریڈچ برطانیہ

22 جنوری 2004ء

---

(۱) تیسیر الفقہ علامہ قرضاوی ص ۱۹۰

مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
اور حدیث
کنت نبیا و آدم بین
الروح و الجسد

فرمان رسول ﷺ کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟

والسلام
حافظ طارق احمد
کلر سنٹر ہائی سٹریٹ ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس عنوان پر شیخ الاسلام قاضی شام مجدّد و مفسّر امام تقی الدّین سبکی مصری شافعی رحمہ اللہ کے فتاویٰ السبکی سے اکتساب فیض کرتے ہوئے آئندہ سطور میں اظہار خیال کیا جارہا ہے۔ وباللّٰہ التوفیق

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور

(۱) آل عمران : ۸۱

ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اسکی مدد کرنا۔۔۔

مفسّرین قرآن کے قول کے مطابق اس آیہ کریمہ میں رسول سے مراد ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد ﷺ ہیں اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے آپ کے متعلق عہد و میثاق لیا کہ اگر اسکے زمانہ نبوت اور دور رسالت میں آپ تشریف لائیں تو لتؤمنن به ولتنصرنّه تمہیں ضرور ضرور آپ پر ایمان لانا اور ضرور ضرور ان کی مدد کرنا ہوگی اور اس سلسلے میں اپنی امت کو وصیت اور تاکید بھی کرنی ہوگی اس فرمان الٰہی سے نبی کریم ﷺ کی تعظیم و توقیر اور آپ کی شان جلالت کا واضح ثبوت ملتا ہے نیز کلام الٰہی اس بات پر بھی قطعی مفہوم پیدا کر رہی ہے کہ آپ ان انبیاء کرام کے دور میں تشریف لانے کی تقدیر پر ان کے بھی مرسل قرار پاتے ہیں تو آپ کی نبوت و رسالت میں تمام مخلوق زمانہ آدم سے لے کر قیامت کے روز تک شامل دکھائی دیتی ہے بایں وجہ تمام انبیاء اور ان کی امم آپ ﷺ کی امت میں داخل ہیں آپ ﷺ کے قول مبارک

بعثت الی النّاس کافّة

''مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے''

میں آپ کے زمانے سے لیکر قیامت تک کے لوگ مراد نہیں بلکہ آپ کے دور اقدس سے پہلے کے تمام لوگ بھی شامل ہیں آپ کے اس فرمان سے آپ ﷺ کے اس قول مبارک

کنت نبیًا و آدم بین الرّوح والجسد

''میں نبی تھا جب کہ حضرت آدم ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے''

کا معنی بھی ظاہر ہو رہا ہے آپ کے اس فرمان کا معنی جو اہل علم یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کے علم میں تھا کہ وہ عنقریب آپ کو نبی کرنے والا ہے۔ وہ اس معنی کی حقیقت تک نہیں پہنچ پائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو تمام اشیاء کائنات کو محیط ہے تو نبی کریم ﷺ کا اس وقت خود کو نبوت سے موصوف کرنا یہی معنی دے رہا ہے۔ کہ آپ اس وقت صفت نبوت سے موصوف تھے اور یہ وصف آپ کیلئے ثابت اور متحقق تھا یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے آپ کا اسم مبارک محمد رسول اللہ عرش عظیم پر لکھا ہوا دیکھا تھا تو یقیناً یہ معنی اس وقت آپ کیلئے ثابت ہو چکا تھا کیونکہ اگر محض علم کی حد تک یہ بات ہوتی کہ آپ مستقبل قریب میں نبی ہونے والے ہیں تو پھر یہ آپ کی خصوصیت نہ تھی کہ آپ نبی ہیں اور آدم ابھی جسم اور روح کے درمیان ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمام انبیاء کو ان کی نبوت کے ساتھ اس وقت اور اس سے پہلے سے جانتا تھا یہ مرتبہ اور خصوصیّت صرف نبی کریم ﷺ کیلئے ہے اسی لئے آپ نے اس خبر سے اپنی امت کو مطلع کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کے مقام و مرتبہ کو پہچانیں اور انہیں اس سے خیر و برکت نصیب ہو۔

اس پر سوال اور اس کا جواب

نبوت تو ایک وصف اور عرض ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ اس کا موصوف اور محل موجود ہو جب کہ آپ ﷺ تو چالیس سال کے بعد اس صفت کے ساتھ موصوف ہوئے تھے آپ اپنے وجود سے پہلے اس صفت سے کیسے موصوف ہو سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ جلّ مجدہ نے اجسام سے پہلے ارواح کو پیدا فرمایا ہے تو کنت نبیّا و آدم بین الروح و الجسد سے آپ کی روح اقدس اور حقیقت عظمیٰ

کی طرف اشارہ ہورہا ہے اور حقائق کی معرفت اور ان کے ادراک سے ہماری عقول قاصر اور عاجز ہیں ان کو ان کا خالق ہی بہتر طور پر جانتا ہے یا وہ شخص ان تک رسائی رکھتا ہے جس کا باطن نور الٰہی سے مستفید ہے پھر ان حقائق سے اللہ تعالیٰ جس حقیقت کو چاہتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے منصۂ شہود پر لے آتا ہے۔ اور اسے کسی بھی وصف سے ہمکنار کر دیتا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ کی حقیقت کو تخلیق آدم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے وصف نبوت عطا فرمادی بایں طور کہ اسے تخلیق فرما کر اس وصف کیلئے تیار کر دیا اور اس وقت اس وصف کا اس پر فیضان کر دیا تو آپ نبی قرار پائے اور آپ کا اسم مبارک محمد رسول اللہ عرش پر لکھ کر آپ کی رسالت کی خبر شائع کر دی تا کہ ملائکہ وغیرہم اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کے شرف و کرامت سے باخبر ہو جائیں تو اس وقت آپ ﷺ کی حقیقت موجود تھی اگر چہ آپ کا جسد مبارک جو اس صفت سے موصوف ہوا وہ متاخر ہے مگر آپؐ کی حقیقت طیبہ جو ان اوصاف عالیہ جو اس پر حضرت الٰہیہ سے افاضہ ہوئی تھیں سے اس وقت بھی موصوف تھی البتہ بعثت اور تبلیغ کا تأخر آپ کے جسد اطہر کی تکمیل سے منسلک رہا بہر حال آپ کی حقیقت معجّل تھی جس میں کوئی تأخر نہ تھا۔

یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو شئی بھی وقوع پذیر ہونے والی ہے اللہ تعالیٰ تو اسے ازل سے ہی جانتا ہے لیکن ہمیں اس کا علم عقلی اور شرعی دلائل سے ہوتا ہےؐ اور کچھ اشیاء کو لوگ ان کے ظہور کے وقت اپنے فہم و ادراک تک پہنچنے کے بعد ہی جانتے ہیں جیسا کہ لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کا علم اس وقت ہوا جب جبرئیل علیہ السلام پہلی بار آپ پر قرآن مجید لیکر نازل ہوئے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے افعال سے

ایک فعل ہے اور اسکی قدرت ارادے اور اسکے اختیار کے آثار سے ہے جن سے کوئی خاص محل موصوف ہوتا ہے بہر حال یہ دو مرتبے ہیں پہلا مرتبہ دلیل و برہان سے معلوم ہوتا ہے دوسرا مرتبہ دیکھنے اور عیان سے تعلق رکھتا ہے پھر ان دو مرتبوں کے اللہ تعالیٰ کے افعال کے ظہور کیلئے کچھ درمیانی واسطے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اختیار کے مطابق ہی پیدا ہوتے ہیں بعض تو وہ ہیں جو کچھ لوگوں پر اس کام کے حدوث اور پیدا ہونے کے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو اس کے حدوث کے بعد ان پر ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے ساتھ اس محل کیلئے کمال حاصل ہوتا ہے اگرچہ وہ کسی ایک فرد پر بھی ظاہر نہ ہو پھر اسکی دو قسمیں ہیں کبھی وہ محل اس کمال سے اپنی تخلیق و حدوث کے وقت مقارن و متصل ہوتا ہے اور کبھی تخلیق و حدوث کے بعد مگر اس کا علم ہم تک خبر صادق سے ہی پہنچتا ہے نبی کریم ﷺ جو خیر الخلق ہیں کسی بھی مخلوق کا کوئی کمال آپ کے کمال سے اُرفع و اعظم نہیں ہے۔ اور کوئی محل آپ کے محل سے اشرف نہیں آپ خبر صادق اور صحیح کے ساتھ ہمیں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے اس کمال کے حصول کی خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت نبوت عطا فرما کر آپ کے متعلق انبیاء کرام اور ان کی امتوں سے عہد و میثاق لیا تھا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ آپ تمام انبیاء کرام پر مقدّم ہیں اور امام الانبیاء اور سیّد الرسل ﷺ ہیں۔

پھر اُخذ میثاق میں استخلاف (اپنا جانشین اور قائم مقام بنانا) کا معنیٰ نظر آ رہا ہے اسی لئے لتؤمننّ به ولتنصرنّه پر داخل ہونے والا لام قسم کے لئے ہے خلفاء کیلئے جو بیعت پر قسمیں لی جاتی ہیں وہ اس مقام سے ہی ماخوذ ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی عظیم الشان تعظیم کے سلسلے میں یہ آیہ کریمہ کتنا روشن مینار نظر آ رہی ہے بہر حال نبی

کریم ﷺ ہی نبی الانبیاء ہیں اور یہ مرتبہ آخرت میں ظاہر ہوگا۔ کہ تمام انبیاء کرام علیھم السلام آپ کے پرچم کے نیچے ہوں گے اور دنیا میں بایں طور رونما ہوا کہ شب معراج تمام انبیاء کرام نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی اگر آپ ﷺ حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیھم السلام کے زمانہ اقدس میں تشریف لاتے تو ان حضرات اور ان کی اُمم پر واجب ہوجاتا کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت وحمایت کریں اور یہی وہ میثاق تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرات اَنبیاء کرام سے لیا تھا اسی سے آپ کا نبی الانبیاء اور انکی طرف مرسل ہونا ظاہر ہوتا ہے مگر اس کا اثر ان کا آپ کے ساتھ اجتماع پر موقوف رہا لیکن یہ تأخر ان کے وجود کی طرف راجع ہورہا ہے نہ یہ کہ آپ اس مرتبہ وشان سے موصوف نہ تھے کسی فعل کے قبول محل اور اس کے اہلیت فاعل پر موقوف ہونے میں فرق واضح ہے جبکہ یہاں فاعل کی جہت سے توقف ہے اور نہ ہی ذات نبی ﷺ کی جہت سے بلکہ یہ تو اس زمانے کے وجود کی جہت سے ہے جو ان حضرات پر مشتمل تھا اگر یہ معاملہ ان کے زمانے میں پایا جاتا تو ان پر آپ کی اتباع واجب ہوجاتی یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں تشریف لائیں گے تو وہ آپ کی شریعت پر ہی عمل پیرا ہوں گے جب کہ وہ اپنی شان نبوت پر ہی ہوں ان لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ آپ اس امت محمدیہ کے ایک فرد کے طور پر آئیں گے ہاں آپ اس امت کے ایک فرد بایں طور ہوں گے کہ ہمارے نبی ﷺ کی اتباع کریں گے۔ اور شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق ہی حکم دیں گے تاہم آپ اپنی حالت نبوت پر ہی قائم ہوں اور ان کی شان نبوت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہوگی یونہی اگر نبی کریم ﷺ آپ کے یا حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم وحضرت نوح

علیھم السلام کے زمانے میں تشریف لاتے تو وہ حضرات بدستور اپنی امتوں کی طرف نبی اور رسول رہتے مگر آپ ان پر نبی اور رسول کی حیثیت سے قائم ہوتے تو آپ کی نبوت اور رسالت اُعم اُشمل اور سب سے اُعظم ہے جو اُصول میں ان کی شرائع کے ساتھ مکمل طور پر اتفاق رکھتی ہے۔

خلاصہء کلام

مندرجہ بالا کلام سے ان دو حدیثوں کا معنی اچھی طرح واضح ہوگیا پہلی حدیث بعثت الی النّاس کافۃ مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس سے آپ کے زمانے سے لیکر قیامت تک کے لوگ مراد ہیں مگر اب واضح ہوا کہ ابتدا سے لیکر آخر تک کے اولین و آخرین لوگ اس میں داخل ہیں دوسری حدیث کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد " میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم جسم اور روح کے درمیان تھے"

ہم نے یہ سمجھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے علم میں نبی تھے مگر حقیقت حال اسکے برعکس نکلی بہر حال احکام کو شرائط سے معلّق کرنا دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اس اعتبار سے کہ وہ محل قابل ہوتا ہے اور کبھی اس لحاظ سے کہ وہ فاعل متصرف ہوتا ہے لیکن یہاں پر تعلیق محل قابل کے طور پر ہو رہی ہے۔ اور وہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان حضرات کی طرف مبعوث ہونا اور ان کا خطاب کے سماع کو قبول کرنا اور آپ کا جسد مبارک جو ان سے مخاطب ہو رہا ہے وہ آپ کی ظاہری زبان سے کارفرما ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی باپ کسی شخص کو اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کفوٗ (ہم پلہ) کے ملنے پر وکیل

مقرر کر دیتا ہے تو وہ شخص وکالت کا اہل قرار پاتا ہے۔ اور اسکی وکالت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کفو کے پائے جانے تک اس کا تصرّف توقف اور تاخر میں چلا جاتا ہے بلکہ کبھی ایک لمبی مدت کے بعد وکیل کا تصرّف عمل میں آتا ہے۔ مگر اس سے اس کی وکالت کے صحیح ہونے اور اسکی اہلیت توکیل میں فرق نہیں پڑتا۔ (۱)

عبدالرسول منصور الازہری

8 مارچ 2004ء

---

(۱) از فیوضات: امام تقی الدین سبکی مصری متوفی ۷۵۶ھ فتاویٰ السبکی ج ۱ ص ۴۰۹ طبع بیروت
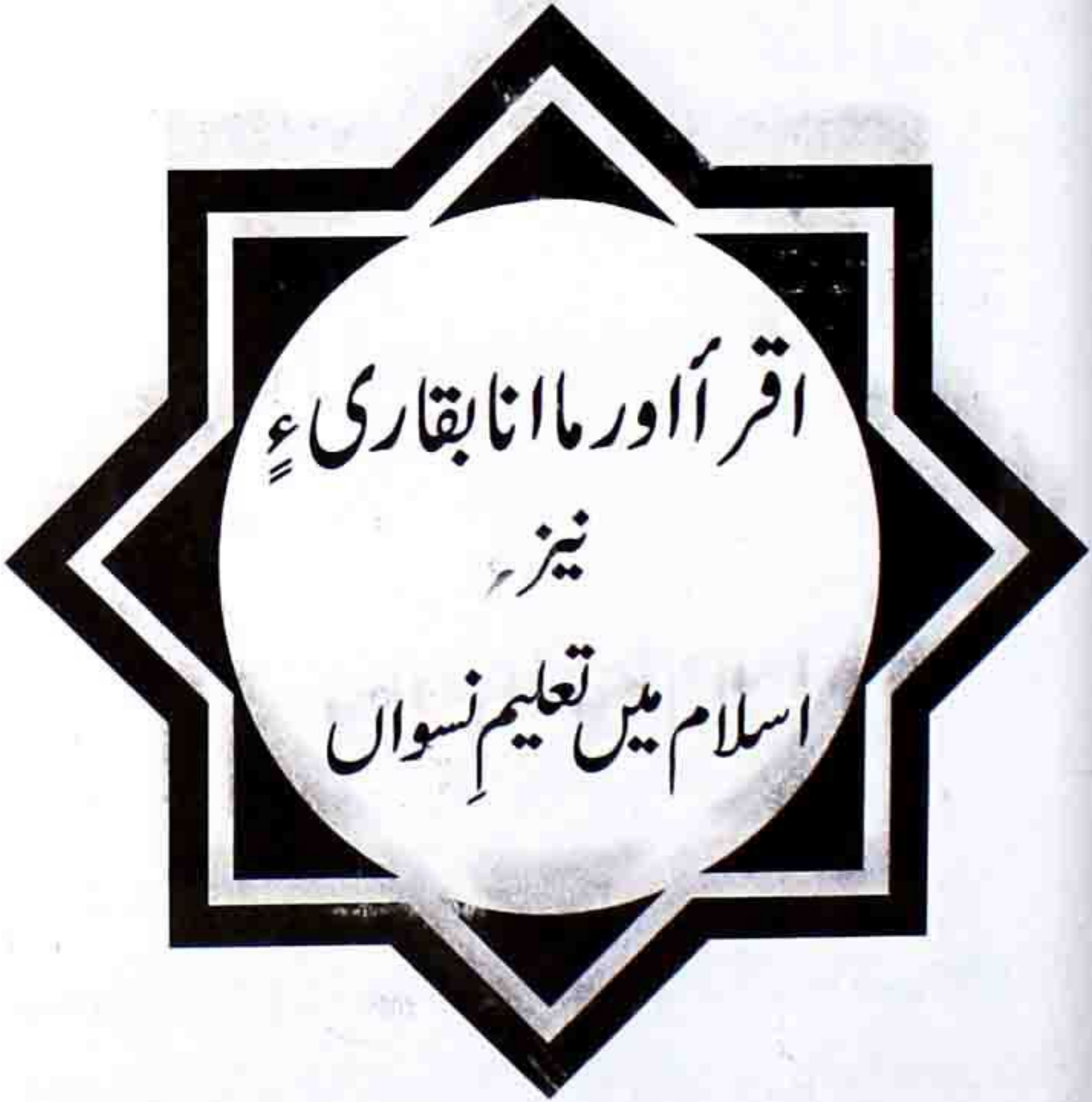
اقرأ اور ما انا بقاریٔ
نیز
اسلام میں تعلیمِ نسواں

وضاحت فرمائیں کہ

1۔ جب آپ ﷺ اُمّی تھے تو حضرت جبرئیل نے آپ کو کیوں کہا کہ ''اقرأ'' اور رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ جبرئیل ہیں مگر آپ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل نہ کی اور فرمایا ما أنا بقاریٍ؟

2۔ اسلام کی نظر میں خواتین کا لکھنا، پڑھنا کیسا ہے ؟

والسلام

پیرزادہ محمد ظہیر الدین نقشبندی مجددی

برمنگھم

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روح الامین حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اقرأ پڑھو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا ما أنا بقاریء، میں پڑھنے والا نہیں ہوں یعنی میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا روح الأمین کو بھی یقین تھا کہ آپ اُمّی ہیں اور پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تو پھر آپ سے کیوں کہا اقرأ پڑھو اور رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم تھا کہ جبرائیل ہیں مگر آپ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل نہ کی جیسا کہ شب اسرأ جب جبرائیل نے عرض کیا انزل فصل براق سے اترو اور نماز پڑھو تو آپ نے فوری طور پر

تعمیل کی مگر یہاں تین بار اقرأ کے جواب میں کہا ما انأ بقاریء نیز روح الأمین نے جب آپ سے کہا اقرأ تو کیا آپ کو کوئی مکتوب دیا تھا جسے پڑھنے کیلئے آپ کو اقرأ کہا بعض محدّثین نے روایت کیا ہے کہ أنّ جبرئیل جاہ بنمط من دیاج مکتوب فقال اقرأ تو اس وقت آپ کے سامنے ایک مکتوب اور تحریر تھی جب جبرئیل کو معلوم تھا کہ آپ اُمّی ہیں تو پھر اقرأ کہنے میں کیا راز تھا۔

پہلی توجیہ

رسول اللہ ﷺ کا اُمی ہونا بھی ایک آزمائش اور امتحان تھا بہت سے لوگ اس سوچ میں پڑ گئے کہ جو کتابت و قرأت نہیں جانتا وہ پڑھے گا کیسے مگر اس فکر میں سرگرداں لوگ یہ نہ جان سکے کہ جو ذات کبریاً وحدہٗ لاشریک انسان کو خون کی بوٹی سے پیدا کر کے اسے قلم کے ذریعے علم دینے پر قادر ہے وہ قلم کے بغیر بھی کسی کو علم دینے پر قادر ہے گویا اس خالق و قادر مطلق نے بتا دیا کہ میں کسی کو قلم کے ذریعے علم دیتا ہوں اور کسی کو قلم کے بغیر اپنے کرم کے ذریعے بھی علم عطا کرتا ہوں۔ قلم کے ذریعے انسان کو جو علم ملتا ہے وہ محدود ہوتا ہے اور اس کے کرم کے ذریعے جو علم ملتا ہے وہ لامحدود ہوتا ہے نہ اس کے کرم کی کوئی حد ہے اور نہ اسکے ذریعے ملنے والے علم کی کوئی حد ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۱)

---

(۱) النساء : ۱۱۳

اور اللہ تعالیٰ نے آپکو وہ سب کچھ سکھا دیا جو آپ نہ جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔

دوسری توجیہ

رسول اللہ ﷺ کا اُمی ہونا مشرکوں اور کافروں کے منہ کو بند کرنے کا ذریعہ تھا کیونکہ اگر آپ قرأت وکتابت کرتے ہوئے جیسا کہ مشرکین مکہ سے کچھ لوگ اس فن سے اچھی طرح آشنا تھے تو وہ کہہ سکتے تھے کہ محمد ﷺ مکہ مکرمہ سے باہر تجارت کیلئے سفر پر جاتے رہتے ہیں تو اس دوران وہ راہبوں اور کاہنوں سے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں۔ تو وہ کہہ دیتے وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۱)

وہ اگلوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھ لی ہیں جو اس پر صبح وشام پڑھی جاتی ہیں۔ مگر جب اس نبی کے متعلق یہ یقین ہو جائے کہ وہ تو اُمی ہے لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا اس کے باوجود وہ ایسی کتاب لایا ہے جس کی فصاحت اور معیار کے ساتھ اس نے عرب کے فصحاء اور اُدباء اور خطباء کو چیلنج کر دیا ہے کہ ہمت ہو تو اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ یہ تحدّی اور ادّعا اس نبی کی طرف سے ہو رہا ہے جو اُمی ہے لا یقرأ ولا یکتب تو مشرکین کا ناطقہ بند کر دیا گیا۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وبارک وسلّم

(۱) فرقان : ۵

مزید تبصرہ

قرأت وکتابت کا سیکھنا یہ قرأت کا سبب ہے اور اس دنیا میں اسباب بھی بہت بڑا فتنہ اور آزمائش ہیں اسی لئے صوفیا کرام نے کہا ہے کہ **الاسباب ھی الباب وھی الحجاب** أسباب دروازہ بھی ہیں اور حجاب و پردہ بھی اسکی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اسباب دینی ہوں یا دنیاوی جوان کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کے مطابق اپناتا ہے اور ان پر بایں طور عمل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنانے کا حکم دیا ہے اور اس اعتقاد کے ساتھ کہ ہر شیٔ میں تاثیر اور حتمی نتیجہ پیدا کرنے والا وہ وحدہٗ لاشریک ہے تو یہ اسباب ایسا دروازہ قرار پاتے ہیں کہ جن سے داخل ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جو شخص صرف اسباب پر ہی ٹھہر جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اگر وہ کھائے نہ تو سیر نہ ہوگا اور پئے نہ تو سیراب نہ ہوگا اور یہی سمجھ لے کہ کھانے اور پانی نے ہی اسکی بھوک اور پیاس کو دور کیا اور کتابوں کے پڑھنے اور پڑھانے ہی نے اسکے اندر علم وحکمت کو پیدا کیا تو یہی اسباب اس شخص کیلئے حق تعالیٰ تک پہنچنے کیلئے حجاب اور پردہ بن جاتے ہیں وہ عمر بھر اسباب کے ساتھ ہی جیتا مرتا رہتا ہے اور عرفان الٰہی تک رسائی نہیں پاسکتا اس بنیاد پر ہی یہ مقولہ درست نظر آتا ہے **العلم حجاب أکبر** بلکہ یہ عقیدہ کہ اسباب ہی تاثیر پیدا کرتے ہیں انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے یعنی جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اسباب ہی ایجاد اور تاثیر رکھتے ہیں اور مسبّبات کا وجود انہی سے وابستہ ہے اجماعاً وہ شخص کافر ہوجاتا ہے۔ بہر حال جو لوگ صرف اسباب تک ہی ٹھہرے اور ان کو ہی موثر اور موجد حقیقی مان لیا وہ

کافر قرار پائے اور جنہوں نے ولایت کا دعویٰ کر کے اَسباب کو چھوڑ دیا وہ زندیق اور بے دین ہوئے اَسباب انسانی اَعضاء کا وظیفہ ہیں اور تاثیر وایجاد اور نتیجہ خیزی قلوب سے متعلق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۱)

امام شعراوی مصری مفسّر قرآن مرحوم کا موقف

دور حاضر میں عظیم مفسّر قرآن امام متولّی شعراوی رحمہ اللہ اس مسئلہ پر یوں رقمطراز ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اقرأ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آپ لا یقرأ و لا یکتب اور رسول اللہ ﷺ جواب دیتے ہیں ما أنا بقارئ میں قاری نہیں ہوں اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں اقوال کے درمیان کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے کہا ما أنا بقاری آپ نے اسباب بشری کو سامنے رکھا کہ آپ نے تو قرأت و کتابت سیکھی ہی نہیں اس لئے وہ اپنے طور پر صادق اور اپنے رب تعالیٰ کے سامنے بھی صادق قرار پائے مگر جب حق تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا اقرأ تو اللہ جل وعلا نے فرشی نہیں بلکہ اسباب عرشی کو پیش نظر رکھا کہ اے محمد ﷺ انت ستقرأ ولکنی لن أرسلک الی معلّم أو الی مدرسة تتعلّم فیها ولکنّک ستقرأ باسم ربّک أی العلم الذی سیأتیک هو من اللّٰه تعالیٰ وهو علم یحیط بعلم البشریّة کلّها ولکنه لایحتاج منک لأن تتعلّم القرأة والکتابة لان اللّٰه تعالیٰ هو الذی سیعلّمک وسیعلّمک مالم تکن تعلم (۲)

---

(۱) آل عمران : ۱۵۸ (۲) السیرة النبویہ محمد شعراوی مصری رحمہ اللہ

ابھی تم پڑھو گے جبکہ میں تجھے کسی معلّم کے پاس بھیجوں گا اور نہ ہی کسی مدرسہ میں آپ قرأت سیکھیں گے اور ابھی تم اپنے رب کے نام کی استعانت اور برکت سے پڑھو گے کہ یہ علم تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آئے گا اور تمہارا رب تمہیں وہ کچھ سکھائے گا جو تم نہ جانتے تھے۔

اقرأ اور قرأت

قرأت کا لفظ لغت عرب میں ابراز اور اظہار کا معنی رکھتا ہے پھر قرأت مکتوب سے بھی ہوتی ہے اور متلوّ (تلاوت کردہ کلام) سے بھی یہاں پر دونوں مراد ہو سکتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پاس کوئی تحریر اور مکتوب تھا جسے وہ پڑھنے کے بارے میں اقرأ کہہ رہے تھے۔ یا وہ متلو کی تلاوت کے متعلق اقرأ کا کلمہ بول رہے تھے اور اس متلو سے روح الأمین آپ پر تلاوت کا اظہار کر رہے تھے یہ آپ کیلئے ایک معجزے کا اعلان تھا کہ جو کل تک اُمی تھا وہ آج معلم کائنات بن کر سامنے آ رہا ہے پھر اقرأ سے آپ کی نبوّت کا ظہور مقصود تھا اور باسم ربک کا معنی یہ ہے کہ یہ نہ تمہاری طرف سے ہے اور نہ ہی آپ کو پڑھانے والے جبرئیل کی طرف سے بلکہ یہ سارا فیض وکمال تمہارے رب کے نام کی استعانت اور برکت سے ہے نیز یہاں پر جو پڑھانا مقصود ہے وہ مذکور نہیں اُھل تفسیر فرماتے ہیں وہ سورۃ القدر ہے جو اس کا بیان ہے۔

اقرأ وربک الأکرم پڑھو اور تمہارا رب ہی اکرم ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ اللہ کے نبی اس کے پیغام رساں اور اس کے نام کی برکت سے پڑھ رہے ہیں تو آپ کو یقین ہونا چاہئے کہ یہ قرأت اور یہ وحی آپ کے رب اکرم کی طرف سے ہے اُکرم

کی تعریف کرتے ہوئے اُہل علم کہتے ہیں۔
ھو الذی یعطی بدون مقابل ولا انتظار مقابل اکرم وہ ہے جو کسی عوض اور اس کی انتظار کے بغیر عطا اور کرم کرے اور یہی وصف ہی اس مقام پر لانا زیادہ مناسب تھا۔اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے الّذی علّم بالقلم جس نے قلم کے ذریعے علم عطا کیا اس فرمان الٰہی سے قلم کی عظمت شان کی خبر ملتی ہے دوسرے مقام پر قلم کی تکریم کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ o مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ o (۱) قلم اور اس کے لکھے کی قسم تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔اس آیہ مبارکہ میں مقسم علیہ یعنی رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی وحی کا انعام مقسم بہ یعنی قلم کی عظمت پر دلیل و برھان دکھائی دے رہا ہے جب کہ مایسطرون سے وحی کی کتابت مراد ہے۔

قلم اور سنّت رسول ﷺ

قلم کی اعلیٰ ترین قسم وہ قلم ہے جس نے ما کان و مایکون الی یوم القیامۃ قیامت کے روز تک جو کچھ ہوا اور ہونے والا تھا لکھ دیا جیسا کہ حدیث مبارک میں بھی آیا ہے أوّل ما خلق اللّٰہ القلم قال لہ اکتب (۲) سب سے اول اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ۔۔۔۔۔

۲۔وہ قلم جو لیلۃ القدر میں سال بھر کی تقدیر لکھتا ہے جس کا اشارہ سورہ دخان میں پایا جاتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ اس میں بانٹ دیا جاتا

---

(۱) القلم : ۱ / ۲ (۲) جامع البیان : ابن جریر طبری ۲۹/۱۰۹/۱۱ طبرانی معجم کبیر حدیث ۱۲۲۲۸

ہے ہر حکمت والا کام۔

۳۔ وہ قلم جس کے ساتھ فرشتہ ماں کے رحم میں بندے کی عمر، رزق اور اس کا عمل اور سعادت وشقاوت لکھتا ہے

۴۔ وہ قلم جو کراماً کاتبین ملائکہ کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ بندوں کے اعمال لکھتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ(۱) كِرَاماً كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (۲) کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ ایک محافظ اسکے پاس تیار نہ بیٹھا ہو۔ معزز کاتب جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

۵۔ وہ قلم جس کے ساتھ لوگ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم تحریر کرتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے اہم اور اعلیٰ وہ اُقلام ہیں جن سے صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے حضور وحی قرآنی کی کتابت کیا کرتے تھے۔ بہرحال الذی علم بالقلم کا جملہ قلم کی ان تمام اُقسام کو شامل ہے۔

سوال اور اس کا جواب

جب نبوت اور رسالت کا آغاز ہی قرأت وکتابت سے ہو رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ اسکے شرف وکرامت کا اعلان بھی کر رہے ہیں۔ تو وہ خود قلم کے ساتھ لکھنا کیوں نہ جانتے تھے بلکہ آپ اُمی ہو کر مبعوث ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ یہی تو آپ کا اکمل معجزہ تھا کہ وہ نبی جو امی ہے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ یکا یک معلم کائنات دکھائی دے رہا ہے۔

---

(۱) ق : ۱۸ (۲) الانفطار : ۱۲/۱۱

امّی و دقیقہ دان عالم　　　بے سایہ و سائبان عالم

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۱)

وہ ان پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور انہیں ستھرا کرتا ہے اور انہیں کتاب اور دانائی کی بات سکھاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ قلم کی شان ضرورت اور اسکی افادیت سے باخبر نہ تھے بلکہ آپ نے اسکی اہمیت وجلالت شان پر پوری توجہ دی اور اس کے مقام کو انسانیت پر اجاگر کیا بایں طور کہ آپ نے وحی قرآنی کی کتابت کیلئے متعدد کاتب مقرر فرمائے جو آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر رہ کر وحی کتابت کا فریضہ انجام دیتے باوجودیکہ آپ قرآن مجید کا حفظ وضبط بھی فرماتے اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے قرآن کریم کے حفظ وضبط کا وعدہ بھی فرمایا تھا ارشاد باری تعالیٰ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰۤی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ (۲) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۳)

اب ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم نہ بھولو گے مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک ہم نے ہی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

امام ابن قیم جوزی کا تبصرہ

شیخ ابن قیم الجوزی فرماتے ہیں کہ خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیھم کے علاوہ ۱۷ ایسے اصحاب تھے ہیں جو کتابت وحی پر مامور تھے نیز آپ ﷺ نے قلم کے ساتھ تعلیم اور

---

(۱) آل عمران: ۱۶۴ (۲) الاعلیٰ: ۶، ۷ (۳) الحجر: ۹

کتابت وحی پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ کتابت کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اَنّ رسول اللہ ﷺ امرہ ان یعلم الناس الکتابۃ بالمدینۃ کان کاتبا محسنا (۱)

رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ منورہ میں لوگوں کو کتابت سکھانے کا حکم دیا۔ آپ بہترین خوش نویس کاتب تھے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے علّمت ناسًا من اھل الصفّۃ الکتابۃ والقرآن میں نے اصحاب صفہ سے کچھ لوگوں کو کتابت اور قرآن سکھایا اسی طرح اس وقت کے ملوک اور حکمرانوں کو دعوت اسلام بھی کتابت کے ساتھ جاری ہوئی تھی آپ نے ان کی طرف مکتوبات روانہ فرمائے تھے۔

نیز یہ بات بھی تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے کہ غزوہ بدر میں قید ہوکر آنے والے قیدیوں سے جو مال بطور فدیہ اُدا نہ کرسکا آپ ﷺ نے فرمایا جوان میں لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ مدینہ منورہ کے دس دس بچوں کو کتابت سکھادے تو وہ آزاد کردیا جائے گا۔ جبکہ اس وقت مسلمانوں کی مالی حالت بہت کمزور تھی وہ مال اور اسلحہ کے شدید محتاج تھے مگر آپ نے اس پر بچوں کی تعلیم اور قرأت وکتابت کو ترجیح دی آپ کے اس فیصلے سے دو چیزیں سامنے آتی ہیں ایک تو تعلیم کی اہمیت اور اس پر توجہ کی ضرورت اور دوسری یہ بات کہ کفار اور غیر مسلموں سے مسلمان کا تعلیم حاصل کرنا بشرطیکہ اس کا تعلق دین اور عقائد سے نہ ہو جیسا کہ دور حاضر میں بھی مسلمان بچے غیر

---

(۱) الاستیعاب : ابن عبدالبر رحمہ اللہ

مسلم اساتذہ سے ہر قسم کی جدید صنعت حساب ڈاکٹری زراعت اور حربی وغیرہ کی تعلیم لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد بہت سے مدنی مسلمان قرأت وکتابت کا فن سیکھ گئے حتی کہ کاتبان وحی کی تعداد ۴۲ تک چلی گئی پھر اسلام کی تعلیمات کے ساتھ کتابت کا رواج بھی عام ہوتا گیا چنانچہ قرض کی توثیق کے سلسلے میں تو اللہ تعالیٰ نے یہ نص بھی نازل فرمادی۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۱)

اے ایمان والو جب تم ایک مقرر مدت تک کسی قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔

اسلام میں خواتین کا لکھنا پڑھنا۔

اس مسئلہ پر دو احادیث رقم کی جاتی ہیں۔

پہلی حدیث

حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے دخل علّی رسول اللہ ﷺ وأنا عند حفصة فقال لی الا تعلّمین هذه رقية النّملة كما علّمتيها الكتابة (۲)

شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر تھی کہ رسول اللہ ﷺ حجرہ مقدسہ میں داخل ہوئے اور مجھ سے فرمایا کہ تو اسے چیونٹی کا دم کیوں نہیں سکھاتی جیسا کہ تو نے اسے کتابت سکھادی ہے

---

(۱) بقرہ : ۲۸۲ (۲) المنتقی : عن احمد وابی داود

صاحب المنتقی فرماتے ہیں کہ اس سے عورتوں کا کتابت سیکھنا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری حدیث:

یہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اسے امام ابوعبداللہ حاکم اور امام بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے ارشاد رسول ہے لا تنزلوهن الغرف ولا تعلّموهنّ الكتابة علّموهنّ الغزل وسورة النّور۔ خواتین کو بالا خانوں میں نہ ٹھہراؤ اور انہیں کتابت بھی نہ سکھاؤ بلکہ انہیں کاتنے اور سورہ نور کی تعلیم دو امام شوکانی نیل الأوطار میں لکھتے ہیں کہ حدیث شفأ بنت عبد اللہ عورتوں کا فن قرأت و کتابت سیکھنے کے جواز پر دلیل ہے اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا فتنہ وفساد کی شرط پر محمول ہے مگر جہاں تک خواتین کے حق میں علم کا تعلق ہے اس پر کسی کا بھی خلاف نہیں کیونکہ علم من حیث العلم یہ جہل اور بے علمی سے کہیں افضل وارفع ہے پھر علم کی دوقسمیں ہیں ایک علم سماع اور تلقّی یہ تو رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کی سیرت وعادت ہے فقہ کتاب وسنت میں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سیرت اور طرز عمل ایک خوبصورت نمونہ دکھائی دیتی ہے۔

علم کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کی تحصیل بذریعہ کتابت وقرأت ہو اسکے جواز اور عدم جواز کا مدار مصلحت اور مفسدت پر ہے فساد اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو اسکی تحصیل سے منع کرنا جائز ہے اور مصلحت ومنفعت کے پائے جانے کا امکان ہو تو اسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے علامہ قلنشری رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ان جماعة من النّساء كنّ يكتبن ولم ير أنّ احد امن السلف

أنکر علیهنّ (۱)

عورتوں کی ایک جماعت لکھتی پڑھتی تھی اور کسی بھی پرانے عالم نے اس پر انکار اور مواخذہ نہیں فرمایا جب کہ دور حاضر میں خواتین کی تعلیم ایک اہم تقاضہ اختیار کر چکی ہے پس ان کی تعلیم و تربیت کیلئے مناسب طریقہ کار اور ان کی شان و حالت کے مطابق ماحول پیدا کرنا ضروری ہے۔

عبدالرسول منصور الازہری

8 اپریل 2004ء

(۱) اضواء البیان امین بن محمد مرحوم ۱۳۹۳ھ ج ۹ طبعہ بیروت لبنان
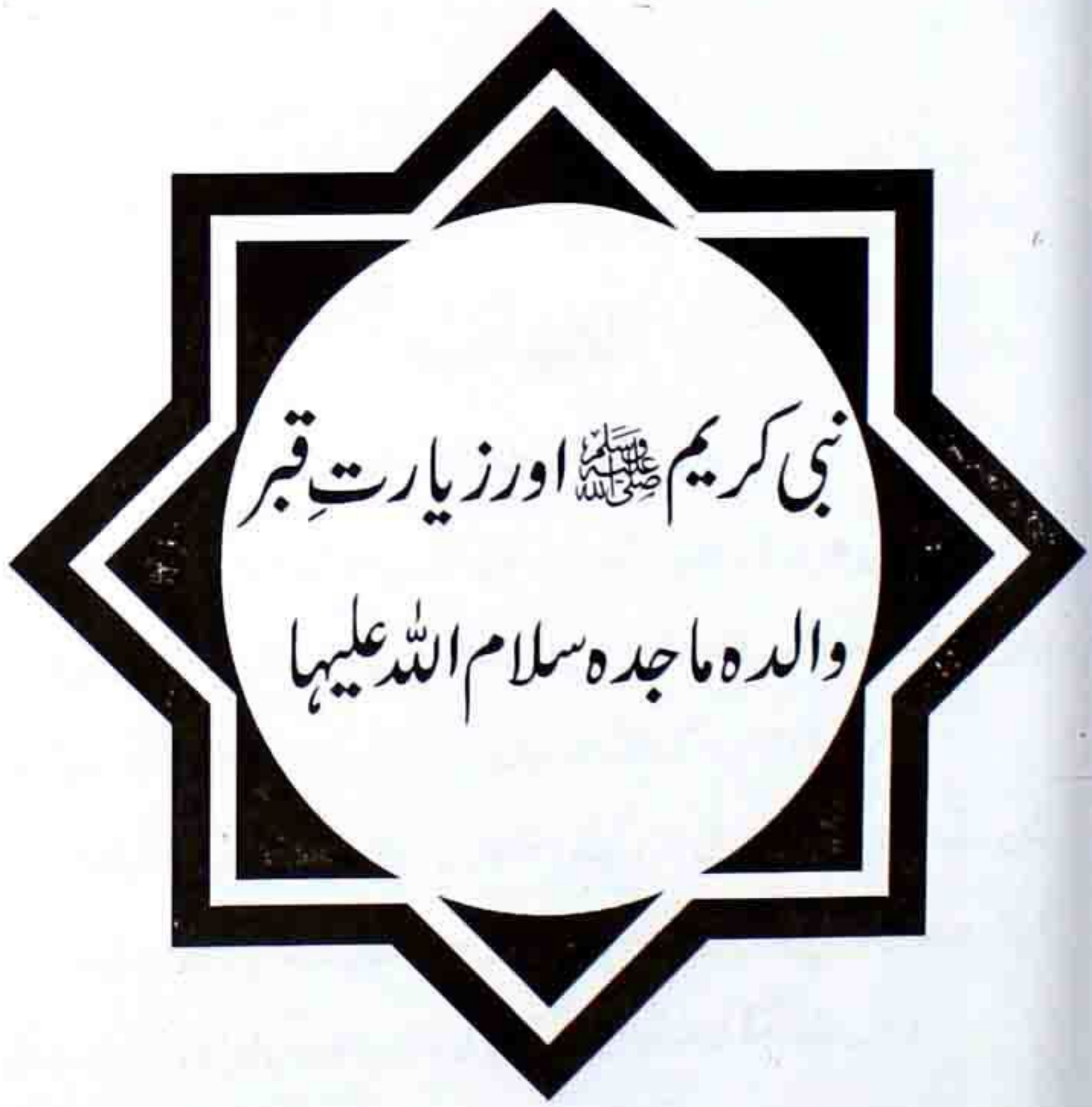
نبی کریم ﷺ اور زیارتِ قبر
والدہ ماجدہ سلام اللہ علیہا

کیا نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین اہل ایمان میں سے تھے ؟

(حضرت علامہ مولانا)
امجد رضا چشتی مصباحی
برمنگھم

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ استأذنت ربیّ أن أستغفر لأمیّ فلم یأذن لی و استأذنته أن ازور قبرها فأذن لی(۱)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کیلئے استغفار کی اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے اجازت نہ دی پھر اپنی ماں کی قبر کی اجازت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ ماجدہ کی قبر انور کی زیارت کی اجازت دی اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی والدہ ماجدہ مؤمنہ تھیں کیونکہ کفار کی قبر پر کھڑے ہونے سے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرما دیا تھا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ (۲)

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز (۲) التوبہ : ۸۴

آپ کفار میں سے کسی کی نماز جنازہ پڑھیں اور نہ ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں۔

اگر آپ کی والدہ مؤمن نہ ہوتیں تو آپ کو ان کی قبر کی زیارت کی اجازت نہ دی جاتی کیونکہ کفار کی قبروں پر کھڑے ہونے سے آپ کو منع کر دیا گیا تھا۔

رہا یہ سوال کہ آپ کو اپنی والدہ کیلئے استغفار کی اجازت کیوں نہ دی گئی اس کے جواب میں امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ مسالک الحنفاء میں رقم طراز ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں اہل علم نے تین نظریات پیش کئے ہیں۔

پہلا یہ کہ آپ کے والدین اہل فترت میں سے تھے۔ اور تمام اہل فترت نجات یافتہ ہیں اس مسلک پر استغفار کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ پہلے آپ کی والدہ مکلّف نہ تھیں اور غیر مکلّف کیلئے استغفار نہیں کیا جاتا۔

دوسرا یہ کہ آپ کے سلسلہ نسب کے تمام آباء اور تمام امہات مومن ہیں اس مسلک پر استغفار کی اجازت نہ دینے کی وجہ یہ تھی تا کہ معصیت کا وہم پیدا نہ ہو

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ قبر میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کو زندہ کیا گیا اور وہ قبر میں آپ پر ایمان لا کر دولت ایمان سے مشرف ہوئے اس مسلک پر استغفار کی اجازت نہ دینے کی وجہ واضح ہے۔(۱)

---

(۱) شرح مسلم علامہ سعیدی زید مجدہ کتاب الجنائز ۔ مسالک الحنفاء علامہ سیوطی مصری رحمہ اللہ

عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت حجّ بنا رسول اللّٰہ ﷺ حجّة الوداع فمرّ علی قبر أمّہ وھو باک حزین مغتمّ فبکیت لبکائہ ﷺ ثمّ انہ نزل فقال یا حمیراء استمسکی فاستندت الٰی جنب البعیر فمکث عنیّ طویلا ملیّا ثم انہ عاد الیّ وھو فرح فتبسّم فقالت لہ بأبی انت وأمیّ یا رسول اللّٰہ نزلت من عندی وانت باک حزین مغتم فبکیت لبکائک ثم عدت الیّ وأنت فرح تبسّم فھمّ ذا یارسول اللّٰہ فقال ذھبت لقبر آمنة أمیّ فسألت أن یحیھا فأحیاھا فآمنت بی او قال فآمنت وردّھا اللّٰہ عزوجل (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ہم حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر تھے کہ آپ اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لائے اور حزن وملال کی حالت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے آپ کی اس حالت پر میں بھی رونے لگی پھر آپ سواری سے اُترے اور مجھے فرمایا اے حمیراء کچھ دیر ٹھہرو میں نے اونٹ کے ساتھ ہی ٹیک لگالی جب آپ کافی دیر بعد واپس آئے تو آپ خوش اور متبسّم دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے آپ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے والدین آپ پر قربان جب آپ میرے پاس سے گئے تھے تو آپ غمگین اور رورہے تھے حتّی کہ میں بھی آپ کے رونے پر رورہی تھی مگراب آپ خوش وخرم اور مسکرارہے ہیں۔تو آپ نے فرمایا میں نے اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دی تو اللہ تعالیٰ

---

(۱) الروض الانف امام سہیلی ج ۱ ص ۲۹۹

سے عرض کیا کہ وہ اسے زندہ فرمادے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ فرمادیا اور وہ مجھ پر ایمان لے آئیں اور پھر واپس اسی حالت پر چلی گئیں۔

مذکورہ بالا حدیث پر بحث اور تمحیص

امام ابن کثیر رحمہ اللہ امام سہیلی رحمہ اللہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے اگر چہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات ممکن ہے مگر امام بدرالدین شارح بخاری محمود عینی مصری رحمہ اللہ شرح سنن ابوداؤد میں اس پر یوں رقمطراز ہیں

قلت الذی ذکرہ السهیلی هوا لألق بحضرۃ الرسالة وتدفع المعارضة بأن یکون وقوع حدیث الاحیاء بعد وقوع الذی ثبت فی الصحیح (۱)

میرا قول یہ ہے کہ اس مسئلہ پر امام سھیلی نے جو ذکر کیا ہے وہی حضور رسالت مآب ﷺ کی شان و مقام کے لائق ہے اور جہاں تک اس روایت اور حدیث مسلم کے درمیان تعارض کا تعلق ہے تو وہ معارضہ یوں دور کیا جاتا ہے کہ آپ کے والدین کریمین کے زندہ کرنے والی حدیث کا وقوع صحیح مسلم والی حدیث کے وقوع کے بعد ہوا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ امام سھیلی نے روض الأنف میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا

---

(۱) شرح سنن ابوداؤد بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵

واللّٰہ قادر علٰی کلّ شیء ولیس تعجز رحمته وقدرته عن شیء ونبیّه علیه السّلام أهل أن یخصّه بما شاء من فضله وینعم علیه بما شاء من کرامته صلوات اللّٰہ علیه و آله وسلّم (۱)

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے حضرت ابراہیم اور حضرت عزیر علیہما السلام کیلئے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کیا اور نبی کریم ﷺ کو رب العالمین نے جن بے اندازہ اور کثیر خصوصیات سے نوازا ہے ان کے پیش نظر کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی دلجوئی کیلئے آپ کے والدین کو زندہ کر کے شرف اسلام سے مشرف فرمایا ہو۔

آپ کے والدین اہل فترت سے تھے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیخ عز الدین بن عبد السلام رقم طراز ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا گیا اس بنا پر اس نبی کی ذرّیت اور اس قوم کے سوا سب لوگ اہل فترت سے ہوں گے اور آپ ﷺ کے والدین کریمین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور نہ ہی ان کی قوم سے اس لئے یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین اہل فترت سے تھے اور اہل فترت کے نجات یافتہ ہونے پر اشاعرہ مالکیہ اور محققین احناف کا اجماع ہے اور اس اجماع کی بنیاد قرآن مجید کی درج ذیل آیات ہیں وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۲)

ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔

---

(۱) الروض الانف امام السھیلی ج ۱ ص ۲۹۹، الحاوی للفتاویٰ سیوطی ج ۲ ص ۲۳۰ (۲) اسراء : ۱۵

وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (۱)

اور ہم ان کو اس سے پہلے عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور کہتے اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجا تا کہ ہم ذلیل ورسوا ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کر لیتے۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ٥ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲)

ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا تو پہلے اس بستی میں اپنے عذاب سے ڈرانے والوں کو بھیجا اور ہم ظالم نہیں۔

قرآن مجید کی ان آیات سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ ہے کہ جب تک وہ کسی قوم میں نبی نہ بھیجے اس وقت تک ان کو مکلّف قرار دیتا ہے نہ ان کو مستحق عذاب قرار دیتا ہے۔ اور یہ لوگ اہل فترت ہیں۔ اور اُز روئے قرآن نجات یافتہ اس اصول کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین نجات یافتہ قرار پائے (۳)

فقیہ امام عبدالرّحمان الجزیری کا موقف

فقہ علی مذاہب اُربعہ کے مؤلف علاّمہ الجزیری نے اس مسئلہ پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں

بعد أن قرر اللّٰه ذالک اراد أن يظهر منّته على عباده فقال عزّوجلّ وما كنّا معذّبين حتّىٰ نبعث رسولًا ٥ فلا يؤاخذ اللّٰه النّاس

(۱) طٰہٰ: ۱۳۴ (۲) شعراء: ۲۰۸، ۲۰۹ (۳) الحاوی للفتاوٰی ج ۲ ص ۲۱۰

بضلالهم ولا يعذّبهم فى الآخرة على عقائد هم وأقوالهم وأعمالهم التى لا يرضاها الّا بعدأ ن يرسل رسلا لئلاّيكون للنّاس حجّة بعد الرّسل فان لهم أن يقولوا انّنا لانعلم ان هذه العقائدأو هذه الأ قوال و الأعمال لاترضيك فتكون لهم ا لمعذرة ولايكون لله عليهم الحجة البالغة . وبعد فلم يثبت أن آباء النّبى ﷺ كانوا مشركين بل ثبت أنّهم كانوا موحّدين فهم أطهار مقرّبون ولا يجوز ان يقال أن ابو ى النبىّ ﷺ كافر ان علٰى أى حال بل هما فى أعلى فراولين الجنّات (۱)

اس بات کے ثابت ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے احسان وکرم کو ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیج دیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کی گمراہی پر مؤاخذہ نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں ان کے ان اعمال واقوال اور عقائد پر عذاب دے گا جنہیں وہ پسند نہیں کرتا الّا یہ کہ ان کی طرف کوئی رسول بھیج دے تا کہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے کوئی عذر اور حجت نہ رہے کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ ہم تو ان عقائد اور اعمال واقوال کو جنہیں تو ناپسند کرتا تھا جانتے ہی نہ تھے ان کے پاس یہ معقول عذر ہوگا اور یوں اللہ تعالیٰ کیلئے ان کے خلاف کوئی مضبوط حجت نہ ہوگی۔ نیز ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے اباؤ اجداد مشرک تھے بلکہ یہی ثابت ہوا ہے کہ وہ موحد (اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک ماننے والے) تھے اور مطہر ومقرب تھے لہٰذا یہ کہنا جائز نہیں کہ کسی حال

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص ۲۱۳ مطبعہ الریاض

میں بھی رسول اللہ ﷺ کے والدین کافر تھے بلکہ وہ تو جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے میں تشریف فرما ہیں۔

حدیث علم سے ایک اشکال اور اس کا جواب

صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ این ابی میرا باپ کہاں ہے۔آپ نے فرمایا فی النار دوزخ میں۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے اس کو بلایا اور فرمایا انّ أبی و أباک فی النّار تیرا اور میرا باپ جہنم میں ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں باپ سے مراد آپ کا چچا ابولہب ہے امام عبدالرحمان الجزیری اس حدیث کی تأویل میں فرماتے ہیں کہ یہاں نبی کے اُب سے مراد اُبولہب ہے کیونکہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قطعاً آپ کو فی النار ہونے کی خبر دی ہے اور لغت عرب میں چچا پر اُب کا اطلاق معروف ہے پھر حدیث کی نص بھی اس تأویل کی تائید کر رہی ہے۔ کہ جب ایک مسلمان نے اپنے باپ کے ٹھکانے کے بارے آپ سے پوچھا جو شرک کی حالت میں مرا تھا اور اس نے آپ کی دعوت اسلام کو رد کر دیا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا انّہ فی النار وہ جہنم میں ہے اس بات کے بعد اس شخص کے چہرے پر حزن وملال اور تأسف کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اس کی دلجوئی اور اس سے اس تأسف کو دور کرنے کے لئے دوبارہ بلایا اور اس سے فرمایا انّ أبی و أباک فی النّار ۔کہ میرا اور تیرا باپ دونوں جہنم میں ہیں۔

یعنی جس طرح تیرا باپ مجھ پر ایمان نہ لا کر جہنم میں ہے تو تو اس پر متأسف

نہ ہو کہ میں رسول اللہ ہوں اور میرا باپ یعنی ابولہب بھی مجھ پر ایمان نہ لا کر جہنم میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو یہ خبر قطعاً دے دی تھی کہ وہ ایمان نہ لا کر جہنم میں داخل ہوا ہے۔

میرے علم وفکر کے مطابق اس معنی میں کوئی تعسف اور تکلف نہیں اور یہی ظاہری طور پر مفہوم و معقول ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ خبر دے رہے ہیں کہ ان کے باپ جہنم میں ہیں جنہوں نے آپ کی دعوت اسلام میں آپ کے ساتھ مقابلہ و معارضہ نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے آپ کے لائے ہوئے دین کو چھوڑا تو ایسی بات میں لوگوں کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کیونکہ اندریں صورت تو کسی کو کوئی زجر و وعید نہ ہوئی۔ اسی صورت میں صحیح اور مفید ہوگی کہ لوگوں کو زجر و توبیخ کی جائے کہ ابولہب آپ کی دعوت اسلام کا معارضہ اور مقابلہ کر کے جہنم میں چلا گیا۔ (۱)

امام جلال الدین سیوطی کا ضابطہ

امام جلال الدین سیوطی مصری رحمہ اللہ نے ایک جامع اور کلی جواب یہ دیا ہے کہ جو احادیث بظاہر والدین کریمین کے ایمان اور ان کی مغفرت کے خلاف ہیں ان سب کا حکم قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے منسوخ ہے۔ ارشاد باری ہے

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۲)

اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔

---

(۱) فقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص ۲۱۴ طبعہ ریاض (۲) الاسراء ۱۵

امام ابوالقاسم سہیلی کا موقف

لیس لنا ان نقول نحن هذا فی أبویه صلی اللہ علیہ وسلم لقوله علیه السّلام لاتؤذوا الأحیاء بسبب الأموات (۱)

واللّٰه تعالٰی عزّوجلّ یقول اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (۲)

ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کی شان میں کہیں معاذ اللہ وہ جہنم میں ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مردوں کو گالی دیکر زندوں کو تکلیف نہ دو اور ارشاد باری تعالیٰ ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیتے ہیں ان پر دونوں جہانوں میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے نیز اس حدیث کو معمر بن راشد رحمہ اللہ نے بالفاظ دیگر روایت کیا ہے جس میں انّ أبی و أباک فی النّار کے الفاظ نہیں بلکہ یہ الفاظ مذکور ہیں اذا مررت بقبر کافر فبشّره بالنّار (۳)

جب تو کسی کافر کی قبر کے پاس سے گذرے تو اسے جہنم کی بشارت دے۔

شارح صحیح مسلم علامہ سعیدی کا ایمان افروز تبصرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابوین شریفین کے ایمان کا مسئلہ ہر چند کہ اصولی اور اعتقادی نہیں ہے تاہم حسن عقیدت اور آپ سے محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے ایمان

---

(۱) کنز العمال ۳۷۲۱۷ حدیث حسن (۲) الاحزاب/۵۷ ،الروض الانف امام سہیلی ج ۱ ص ۲۹۷

(۳) روض الانف ج ۱ ص ۲۹۹

کا قول کیا جائے کیونکہ ہمارے آباء واُمہات مومن ہوں اور سرکار کے اُبوین مومن نہ ہوں ہمیں اپنے آباء کے ایمان اور اسلام کا شرف حاصل ہو اور آپ کو یہ شرف حاصل نہ ہو اس بات کو ایک مومن کی محبت اور غیرت ایمان گوارا نہیں کرتی اس باب میں کم سے کم بات یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے اور اُبوین کریمین کے بارے میں کوئی ایسا کلمہ نہ کہا جائے جو اُبوین کریمین کے استخفاف اور رسول اللہ ﷺ کی دل آزاری کا موجب ہو۔(۱)

ازعبدالرسول منصوراز ہری

ریڈچ

7ربیع الاول1425ھ

(۱) شرح مسلم علامہ سعیدی ج ۲ ص ۸۷۲

وحی کے بند ہونے کے
دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خودکشی کی روایت؟

وحی الٰہی کے بند ہونے کے دوران رسول اللہ ﷺ کی خودکشی کی روایت کہاں تک درست ہے؟

استفتاء

قاری غلام نبی

خطیب جامع مسجد محمدیہ پل عارف روڈ ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ پہلی وحی کے اترنے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو آپ پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے حضرت خدیجہ نے آپ کو بھرپور تسلّی دی اور آپ کو حضرت ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس لے گئیں جو رشتے میں حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے انہوں نے بھی آپ کو تسلّی دی اور اپنے خوبصورت جذبات کا اظہار کیا اسکے کچھ عرصہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا اور وحی کا آنا بھی بند ہوگیا بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ

ثم لم ینشب ورقة أن توفی وفتر الوحی فترة حتّی حزف النبیّ ﷺ . فیما بلغنا حزنا غدا منه مرارًا لی یتودّی من رؤس شواهق الجبال فكلّما أوفیٰ بزروة جبل كی یلقی منه نفسه تبدّی له جبرئیل

فقال یا محمد انک رسول اللہ حقا فیسکن لذالک جأشه وتقرّ نفسه فیرجع فاذا طالت علیه فترة الوحی غدا لمثل ذالک فاذا اوفیٰ بزروة جبل تبدّی له جبریل فقال له مثل ذالک (۱)

پھر کچھ عرصہ کے بعد حضرت ورقہ فوت ہو گئے اور وحی کا سلسلہ بھی بند ہو گیا یہاں تک نبی کریم ﷺ رنج وملال میں پڑ گئے جو بات ہم تک پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے حزن وملال کا یہ عالم تھا کہ کئی بار آپ نے پہاڑوں کی چوٹیوں سے خود کو گرانے کی کوشش کی جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی سے خود کو گرانے کی تیاری کرتے تو آپ کے سامنے حضرت جبریل آجاتے اور آپ سے کہتے یا محمد ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو اس سے آپ کا اضطراب کم ہو جاتا اور آپ کے دل کو قرار مل جاتا اور آپ واپس لوٹ آتے سلسلہء وحی کے انقطاع کے دراز ہو جانے پر جب بھی آپ ایسا کرنے کی کوشش کرتے تو ہر بار جبریل ظاہر ہو کر آپ کو تسلی دیتے۔

بخاری شریف کی اس عبارت میں وفتر الوحی اور وحی کا آنا بند ہو گیا۔ کے بعد حتّی حزن النبیّ ﷺ فیما بلغنا حزنا غدا منه مرارًا ....

یہ امام زہری کا اضافہ ہے جس کا صحیح حدیث سے کوئی تعلق نہیں پھر اسی زیادتی اور اضافے کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے المسند میں، ابونعیم اصبہانی نے دلائل النبوہ اور امام ابو بکر بیہقی نے دلائل النبوہ میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (۲)

پھر اس اضافے کی دو علتیں ہو سکتی ہیں پہلی علت اس حدیث کے راوی

---

(۱) بخاری ۶۹۸۲ سیرت نبویہ امام متولی شعراوی ص ۱۲۸ (۲) مسند احمد ج ۶ ص ۲۳۲، دلائل النبوہ ابونعیم ص ۶۸، دلائل النبوہ بیہقی ج ۱ ص ۳۹۳، سیرت نبویہ امام شعراوی ص ۱۲۹

یونس اور عقیل کے علاوہ صرف معمر نے اس اضافے سے اسے روایت کیا ہے تو یہ معمر کے تفرد ہونے کی بنائ پر روایت شاذہ ہے جو مردود قرار دی گئی ہے۔

اور دوسری علّت یہ ہے کہ یہ روایت مرسلہ معضلہ ہے کیونکہ سیاق کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وفیما بلغنا ہم تک یہ بات پہنچی ہے یہ زہری کا قول ہے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اس بات کو یقینی کہا ہے وہ فرماتے ہیں

وهو من بلاغات الزّهري وليس موصولاً (۱)

"یہ امام زہری کے اضافات میں سے ہے متصل نہیں ہے"

دور حاضر کے شیخ البانی بھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اضافہ متصل سند سے واقع نہیں ہوا اس لئے ناقبل حجت ہے۔ (۲)

تو اس اضافے کے عدم ثبوت پر قطعی بات یہی کی جاسکتی ہے کہ یہ اضافہ من حیث المعنیٰ منکر اور نا قابل اعتبار ہے کیونکہ یہ معصوم نبی کی شان ومقام کے لائق نہیں کہ وہ خود کو قتل کرنے کیلئے پہاڑ کی چوٹی سے گرادے خواہ اس کا کوئی بھی سبب مانا جائے یہ شان نبوت کے منافی ہے جب کہ اس کا خود یہ قول ہے

من تردّى من جبل فقتل نفسه فهو في نار جهنّم يتردّى فيها خالدًا مخلّدًا فيها أبدًا (۳)

"جس نے خود کو پہاڑ سے گرا کر قتل کرلیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نارِ جہنم میں اترتا رہے گا"

---

(۱) فتح الباری ج ۱۲/۳۰۲ (۲) احادیث ضعیفہ رقم ۴۸۵۸ (۳) بخاری، مسلم، الحلال والحرام امام شعراوی ص ۴۴۷

شیخ محمد الصّادق عرجون کا موقف

أقصوصه التّردی من شواهق الجبال أبطولة زائفة مضلّة هزيلة منكرة يجب رفضها وانكارها وانّهاتتعارض مع أصول الايمان بالنبّوة(۱)

پہاڑوں کی چوٹیوں سے گرنے کا قصہ انتہائی گمراہ کن باطل اور بے بنیاد ہے اس کو رد کرنا اور اس کا انکار کرنا واجب ہے کیونکہ یہ ایمان بالنّبوت کے اصولوں سے ٹکراتا ہے اوران کے منافی قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ابوشھبہ رحمہ اللہ کا موقف

الرّواية ليست على شرط الصحيح لأنها من البلاغات وهى من قبيل المنقطع والمنقطع من أنواع الضعيف والبخارى لا يخرج الّا الأحاديث المسندة المتصلة برواية العدول الضابطين ولعلّ البخارى ذكرها لينبّهنا الى مخالفتها لما صحّ عنده من حديث بدأ الوحى الذى لم تذكر فيه هٰذه الزّيادة (۲)

یہ روایت صحیح بخاری کی شرط پر نہیں ہے، کیونکہ یہ بلاغات سے متعلق ہے جو منقطع کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور منقطع ضعیف کے اقسام سے شمار ہوتی ہے جبکہ امام بخاری عدولی اور ضابطین راویوں سے احادیث مسندہ متصلہ کی تخریج کرتے ہیں شاید امام بخاری نے اس مقام پر حدیث میں اس زیادتی اور اضافے کا ذکر کر کے

(۱) محمد رسول اللہ ص ۳۸۵ (۲) السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنہ ص ۲۶۵

ہمیں اس کی مخالفت پر تنبیہ کر دی ہے کہ ان کے نزدیک صحیح وہی حدیث ہے جو باب بدأالوحی میں مذکور ہے اور اس میں اس اضافے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس کے بعد امام ابوشہبہ رحمہ اللہ نے اس بات پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس روایت کے ضعیف اور ناقبل اعتبار ہونے کے لئے یہ بھی ایک اقوی دلیل ہے، کہ حضرت جبریل علیہ السلام جب بھی آپ ﷺ کسی پہاڑ کی چوٹی پر آ کر خود کو نیچے گرانے کا ارادہ کرتے تو ہر بار آپ سے کہتے یامحمّد انک رسول اللہ حقا چنانچہ آپ نے کئی بار یہ کلمہ دہرایا اگر یہ صحیح ہے تو رسول اللہ ﷺ کی تسلّی اور تثبیت قلب کیلئے ایک بار کہنا بھی کافی تھا۔(۱)

ڈاکٹر اکرم ضیأ العمری کا بیان

بلاغ الزّهری لا يصلح لاثبات الحادث لتعارضه مع عصمه النبیّ ﷺ ثم انّه مرسل ضعيف ..... لكن ابن حجر ذهب الى انه بلاغ مرسل وليس موصولا (۲)

(یہ اضافہ) زہری کا بلاغ ہے جس سے یہ حادثہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ نبی ﷺ کی عصمت سے متعارض ہے نیز یہ مرسل ضعیف ہے امام ابن حجر رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے کہ یہ بلاغ مرسل ہے موصول نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیّدنا محمّد ﷺ وآلہ وصحبہ وسلّم

عبدالرسول منصور ازہری (9 مئی 2004ء)

(۱) السیرۃ النبویہ فی ضوء القرآن والسنۃ ص ۲۶۵، السیرۃ النبویہ امام شعراوی متولی ص ۱۳۱ (۲) السنۃ النبویہ الصحیحہ ج ۱/۱۲۶، ضیاء العمری

قرآن پاک میں
وبنات عمک وبنات عماتک
میں عم کے مفرد اور عمات
کے جمع لانے کی وجہ

سورہ احزاب میں بنات عمک و بنات عمّاتک میں لفظ عم کے مفرد اور عمات کے جمع لانے میں کیا حکمت و وجہ ہے ؟

استفتاء از

علامہ امجد رضا چشتی

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ احزاب کی آیت کریمہ ۵۰ میں ارشاد باری تعالیٰ و بنات عمک و بنات عمّاتک (اور تمھارے چچا کی بیٹیاں اور تمھاری پھوپھیوں کی بیٹیاں) لفظ عم کے مفرد اور عمات کے جمع لانے میں کیا وجہ ہے اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ عم اسم جنس ہے اور عمۃ ایک پھوپھی کو کہتے ہیں اور اسکی جمع عمات لا کر یہ بتا دیا گیا کہ اس مقام پر آپکی ایک سے زائد پھوپھیاں مراد ہیں اور عم چونکہ اسم جنس تھا اسلئے اسکو جمع لانے کی ضرورت نہ تھی مگر اس جواب پر سوال وارد ہوتا ہے کہ سورہ نور میں عم کی جمع أعمام بھی وارد ہوئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے أو بیوت أعمامکم (یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے) اگر عم کی جمع نہ لانے کی وجہ اس کا اسم جنس ہونا ہے تو پھر اس آیت کریمہ میں بھی اس کو مفرد ہی رکھا جاتا کچھ اہل علم کا یہ موقف ہے کہ آیہ نور میں چچاؤں کے متعلق عمومیت کا ارادہ کیا گیا اسلئے وہاں عمہ کی جمع اعمام لائی گئی اور آیہ احزاب میں پھوپھیوں کی عمومیت کا خیال رکھا گیا اس سے وہاں پر عمہ کی جمع عمات

لائی گئی۔

دوسرا جواب

اس سوال کا دوسرا جواب امام تقی الدین سبکی مصری رحمہ اللہ کے فتاویٰ السبکی سے رقم کیا جارہا ہے آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے سورہ اُحزاب کی اس آیت کریمہ پر غور کیا تو مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کی ذات اُقدس مخاطب ہے جب کہ آیہ نور میں تمام اہل ایمان سے خطاب کیا گیا بلکہ آیہ اُحزاب کا خطاب آپ ﷺ سے مختص ہے ارشاد باری تعالیٰ انا أحللنالک (بیشک ہم نے تمھارے لئے حلال کیا ہے) اور اسکے آخر میں ارشاد ہوتا ہے خالصۃً لک من دون المؤ مینن (یہ تمھارے لئے خاص ہے باقی امت کیلئے نہیں) بہر حال ان کلمات طیبات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں جتنے احکام ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہے مثلاً یہ آپ کیلئے شرط قرار دیا گیا کہ اُزواج مطہرات کو ان کا مہر دیا جائے اور آپ کی کنیزوں کا تعلق اس مال سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فئی اور غنیمت کے طور پر عطا فرمایا ہے اور آپ کے چچا اور پھوپھیوں ماموں اور خالاؤں کی بیٹیوں کے متعلق یہ شرط عائد کی گئی کہ انہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو جب کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے یہ شرط عائد نہیں کی گئی رہا یہ سوال کہ آپ کے حق میں یہ شرط کیوں رکھی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی قدر وشان اور اُرفع اور اعلیٰ ہے اور آپ کا مرتبہ و مقام سب سے بلند و بالا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہر نوع سے آپ کیلئے سب سے اُشرف اُحب اور اُطیب چیز کا ہی انتخاب فرمایا چنانچہ اطیب ازواج وہ

ہیں جنہیں ان کا مہر ادا کر دیا گیا ہو اَطیب المحلو کات وہ ہیں جو مال غنیمت سے ہوں اور آزاد عورتوں سے اَطیب وہ ہیں جو مومنات اور مہاجرات ہوں اور پھر ان میں قدر و منزلت میں اَعلیٰ آپ کے چچاؤں پھوپھیوں ماموں اور خالاؤں کی بیٹیاں ہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ کے نزول کے وقت آپ کے چچاؤں میں صرف حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہی موجود تھے اور نبی کریم ﷺ آپ کی بے حد تعظیم وتکریم فرماتے تھے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تین بیٹیاں تھیں جن میں ایک کا نام اُم حبیبہ تھا امام ابن عبد البر رحمہ اللہ الاستذکار میں حدیث اُم الفضل میں فرماتے ہیں

أن رسول اللّٰہ ﷺ قال لو بلغت أم حبيبه بنت العباس رضی اللّٰه عنه وأنا حيٌ تزوجتها(۱)

اگر اُم حبیبہ بنت عباس بالغ ہوئی اور میں زندہ رہا تو اس سے شادی کروں گا جب کہ اُم حبیبہ سے اَسود بن سیفان بن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم نے شادی کی اُم حبیبہ کی والدہ کا نام اُم الفضل لبابۃ الکبریٰ بنت الحارث بن حرب الھلالیہ ہے یہ قول بھی موجود ہے کہ اُم الفضل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد وہ پہلی خاتون ہے جو اسلام سے مشرف ہوئی حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے شادی کے بعد ان کے بطن سے سات بچے پیدا ہوئے جن میں چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں صفیہ اور اُمیمہ ان کا ایک سگا بھائی بھی تھا جس کا نام کثیر تھا ان تینوں کی والدہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اُم

---

(۱) الاصابہ ابن اثیر ۔ الاصابہ ابن الحجر رحمہ اللہ

ولد (کنیز) تھی بہرحال میرے فکر وخیال کے مطابق قرآن مجید میں لفظ عم کو مفرد اور واحد لا کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ادب ومقام کا ارادہ کیا گیا ہے کہ اُدباً ان کے ساتھ کسی دوسرے کا ذکر نہیں کیا گیا والقرآن بحر لاساحل له قرآن مجید ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں پھر اسکے لفظ ومعنی کی نظم میں ایسے آداب کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عقل انسانی اُن کے ادراک سے عاجز وقاصر نظر آتی ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے چچاؤں میں اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اس آیت کے نزول سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے وہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے ان کی بیٹیاں بھی آپ ﷺ کے حلال نہ تھیں بلکہ آپ کی صرف ایک ہی بیٹی تھی جن کا نام اُمیمہ تھا نبی کریم ﷺ نے اسکی شادی حضرت سلمہ بن اُم سلمہ سے کردی تھی اس آیت شریفہ کے نزول کے وقت آپ کے چچا اُبوطالب کی بیٹی اُم ھانی بھی موجود تھیں جب آپ نے ان سے شادی کا ارادہ فرمایا توانہوں نے عرض کیا میں مہاجرات میں شامل نہیں اس لئے آپ پر حلال نہیں اسی طرح آپ کے چچاؤں میں حضرت زبیر بن عبد المطلب کی بیٹی حضرت ضباعہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھیں مگر وہ مقاد بن اُسود کی بیوی تھیں اور اُبولھب کی بیٹی درّہ وہ بھی حرث بن نوفل بن الحرث بن عبد المطلب کے عقد میں تھی ویسے بھی اُفضل الخلق سے ہونے والے خطاب الٰہی میں شادی شدہ خواتین کو داخل کرنا لائق اور مناسب نہیں چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر بنات العم سے مراد صرف ام حبیبہ بنت عباس رضی اللہ عنہ ہی ہیں جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا لو بلغت وأنا حي لتزوجتها (اسکے بالغ ہونے پر اگر میں زندہ رہا تو اس

سے شادی کروں گا)

قارئین نے ملاحظہ کیا کہ قرآن مجید میں یہ کتنا بڑا اشارہ ہے اور شیخ قریش حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُدب واحترام کا کس قدر خیال رکھا گیا ہے نگاہ رسول ﷺ میں آپ کے مرتبہ ومقام کے پیش نظر لفظ عم کو مفرد اور واحد استعمال کیا گیا والله أعلم بالصواب.

نبی کریم ﷺ کی پھوپھیاں

سیّد عالم اُفضل الخلق ﷺ کی پھوپھیوں کی تعداد چھ ہے

(۱) برّہ ان کی کسی بیٹی کا ذکر تاریخ وسیرت میں نہیں ملتا باقی پانچ کی بیٹیاں تھیں جن میں جحش کی تین بیٹیاں حضرت زینب زوجہ رسول ﷺ اور حمنہ اور حبیبہ

(۲) اُمیمہ بنت عبدالمطلب ان کی بھی بیٹیاں تھیں

(۳) اُم حکیم البیضاء جن کی ایک بیٹی اُروی بنت کریز جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں

(۴) عاتکہ انکی ایک بیٹی کا نام قریبہ بنت اُبواُمیہ بن المغیرہ تھا

(۵) اُروی بنت کلاہ بن عبدمناف ان کی ایک بیٹی جن کا نام فاطمہ تھا

(۶) صفیہ ان کی بیٹی اُم حبیبہ تھی جو اس وقت خالد بن حرام کے عقد میں تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں موجود تھیں جن کے ساتھ آپ کا نکاح حلال قرار پاتا تھا

اس لئے انکے متعلق عمات عمہ کی جمع کا صیغہ وارد کیا گیا جبکہ اُعمام میں یہ صورتحال

موجود نہ تھی۔آپ ﷺ کی پھوپھیوں سے صرف صفیہ عاتکہ اور اُروی نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔(۱)

رضی اللہ عنھن و أرضاھنّ عنّا

و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیّدنا محمد و علی آلہ و صحبہ و سلم

عبدالرسول منصور الازہری

28 جون 2004ء

(۱) فتاوی السبکی ج ۱ ص ۹۰ ،سیرت نبویہ امام شعراوی مصری رحمہ اللہ،طبقات ابن سعد

تعدد
ازواج رسول ﷺ
کی حکمت

تعدد ازواج رسول ﷺ میں کیا حکمت ہے ؟
تفصیل سے بیان فرمائیں۔ شکریہ۔

چوہدری مشتاق احمد
پرنسپل کمپری ہنسو سکول ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نکتہ اولیٰ

سید عالم پیغمبر انسانیت نے متعدد ازواج مطہرات سے اس وقت عقد کیا جب آپ کی عمر شریف پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ یعنی آپ ''سن شیخوخت'' کو پہنچ چکے تھے۔

نکتہ ثانیہ

سیدہ عائشہ صدیقہ بنت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا کے علاوہ آپ نے جتنی عورتوں سے نکاح فرمایا وہ تمام کی تمام ''ارامل ثیبات'' یعنی شادی شدہ اور بیوہ تھیں۔

تعدد ازواج رسول میں چند حکمتیں تھیں۔

تعلیمی حکمت

تشریعی حکمت

اجتماعی حکمت

سیاسی حکمت

تعلیمی حکمت:

رسول کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے تعدد میں غایت اساسی یہ تھی کہ خواتین کیلئے ایک ایسی معلّمہ جماعت تیار کی جائے جو انہیں احکام شرعیہ کی صحیح تعلیم دے سکے اور اسلامی طرز زندگی اپنانے میں ان کی تربیت کر سکے کیونکہ عورتیں معاشرے کا نصف حصہ ہیں ان پر بھی وہ تکالیف فرض ہیں جو مردوں پر فرض ہیں۔

چنانچہ بہت سی عورتیں فطری شرم وحیاء کے پیش نظر حضور ﷺ سے کھل کر اپنے مسائل اور بالخصوص اس صنف سے متعلقہ خصوصی مسائل مثلاً حیض، نفاس، جنابت اور دیگر امور زوجیت وغیرہ دریافت نہ کر سکتی تھیں۔

دوسری طرف رسول خدا ﷺ جو پردہ نشیں کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے آپ بھی عورتوں کے خصوصی مسائل بیان کرنے میں بعض اوقات اشاروں اور کنایوں سے گفتگو فرماتے تھے جو وہ صحیح معنوں میں سمجھ نہ پاتی تھیں اس کی مثال حدیث اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ملتی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اُم سلیم حضرت ابوطلحہ کی بیوی بارگاہ رسول میں حاضر ہوئیں اور کہا یارسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ اظہار حق سے شرماتا نہیں کیا عورت پر غسل واجب ہے جب اسے احتلام ہو آپ نے فرمایا ہاں جب وہ پانی

(مخصوص رطوبت) دیکھے تو اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا عورتیں رسوا ہو گئیں کیا عورتیں بھی محتلم ہوتی ہیں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا اگر عورت محتلم نہیں ہوتی تو بچہ اس کے مشابہ کیسے ہوتا ہے آپ کا مطلب یہ تھا کہ جنین مرد اور عورت دونوں کے مخلوط پانی سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنی ماں سے مشابہت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے "**انّا خلقنا الانسان من نطفةٍ امشاج نبتليه فجعلناه سميعًا بصيرًا**" (دھر) ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط پانی سے پیدا کیا ہم اسے آزمائیں پس ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا"

چنانچہ اس قسم کے سوالات کا جواب ازواج مطہرات رسول اکرم ﷺ سے پا کر عورتوں کو احکام شرعیہ میں راہنمائی فرماتیں۔

اسی لئے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "**رحم الله نسآء الانصار مامنعهنّ الحياء ان يتفقّهن فى الدّين**"

ترجمہ: اللہ عزّ وجلّ انصار کی عورتوں پر رحم فرمائے انہیں دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لئے شرم و حیا حائل نہ ہوتا تھا۔

بہت سی عورتیں رات کی تاریکی میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عورتوں سے متعلق احکام شریعت کی رہنمائی حاصل کرتی تھیں پھر یہ حقیقت بھی اپنے مقام پر مسلّم ہے کہ رسول کریم ﷺ کی سنت مطہرہ فقط آپ کے قول تک محدود نہیں بلکہ آپ کے اقوال، افعال اور تقریر سب سنت نبویہ کے دائرے میں شامل ہیں اور ان سب کا اتباع امت پر واجب اور لازم ہے۔

ازواج مطہرات کے علاوہ آپ کی وہ اخبار و افعال جن کا تعلق گھر سے ہے

کس ذریعے سے ہم تک پہنچ سکتے تھے؟

بلاشبہ آپ کے افعال واطوار جن کا تعلق گھر سے ہے ان کے نقل کرنے میں ازواج رسول نے انتہائی ذمہ دارانہ کردار ادا کیا ہے

تشریعی حکمت

ازواج مطہرات کے متعدد ہونے کی تشریعی حکمت یہ ہے کہ جاہلیت کی بعض باطل عادات ورسومات کا مٹانا بہت ضروری تھا تا کہ اسلامی معاشرت کے خدوخال صحیح معنوں میں اپنے حسن وجمال کی بہار دکھا سکیں اس سلسلہ میں اس مقام پر تبنّی کی بدعت کی مثال پیش کی جاتی ہے اسلام کی آمد سے پہلے عرب میں یہ رسم قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بیٹے کو اپنا متبنّٰی بنالیتا تو اسے اپنے حقیقی اور صلبی بیٹے کی طرح سمجھتے ہوئے اپنے تمام احوال مثلاً میراث، طلاق، زواج، محرمات، مصاہرت اور محرمات نکاح میں مکمل طور شریک کرلیتا تھا۔ جاہلی معاشرے میں یہ رسم دین متوارث کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ جب کوئی کسی بچے کو متبنّٰی بنانا چاہتا تو اس سے کہتا کہ "انت ابنی أرثک وترثنی" (تو میرا بیٹا ہے میں تیرا وارث ہوں اور تو میرا وارث ہے)

اسلام کی الہامی وانقلابی تعلیمات نے یہ گوارا نہ کیا کہ انہیں مزید جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلا جائے تو اس رسم بد کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کیلئے رسول اکرم ﷺ نے الہامی طور پر زید بن حارثہ کو اپنا متبنّٰی بنالیا تو رواج کے مطابق لوگوں نے زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہنا شروع کردیا۔ امام بخاری اور امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر رضی

اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن حارثہ جو نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے ہم انہیں زید بن محمد کہہ کر بلایا کرتے تھے حتیٰ کہ قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی

ادعوهم لآبائهم هو اقسط عند الله

ترجمہ: بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک۔

تو اس کے بعد سیّد عالم ﷺ نے فرمایا

انت زيد بن حارثة بن شراجيل

حضور ﷺ نے حضرت زید کا نکاح اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینب بنت جحش اسعد یہ رضی اللہ عنہا سے خود کیا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی ایک مدت تک اس حثیت پر قائم رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے ازدواجی تعلقات میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی ان سے سخت کلامی کرتی اور زید بن حارثہ کو عبد مملوک سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اعلیٰ حسب و نسب کی وجہ سے اشرف وارفع سمجھتی تھی۔

حکمت الٰہی کے اظہار کا وقت آیا تو حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی انقضاء عدّت کے بعد اللہ عزّ وجلّ نے بدعت متبنّٰی کو ختم کرنے کیلئے نبی اکرم ﷺ کو حضرت زینب سے نکاح کرنے کا حکم دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وتخشى النّاس واللّٰه احقّ ان تخشاه فلمّا قضى زيد منها وطرا زوّجنا كها لكى لا يكون على المؤمنين حرج فى ازواج ادعيائهم اذا قضوا منهنّ وطرًا وكان امر اللّٰه مفعولاً (الاحزاب آیت ۳۷)

اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن و تشنیع) کا حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں پھر جب پوری کرلی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کردیا تا کہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کرلیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔

چنانچہ جب حضرت سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا حریم نبوت میں رونق آفروز ہوئیں تو بہتان کے جس طوفان کا اندیشہ تھا وہ اُمڈ آیا اور بد باطن یہودیوں اور منافقین نے کہنا شروع کردیا کہ دیکھو اپنے بیٹے کی بیوی اپنی بہو کو اپنی زوجہ بنالیا۔ کبھی ایسا اندھیر بھی ہوا تھا ؟ جیسے انہوں نے کردکھایا۔ ان کی اس ہرزہ سرائی کو قرآن مجید نے اس ایک جملہ سے ختم کردیا۔

ارشاد ربانی ہے۔ ما کان محمّدا ابا احد من رّجالکم ولکن رّسول اللّٰہ وخاتم النّبیّین و کان اللّٰہ بکلّ شئی علیمًا (سورہ احزاب آیت ۴۰)

ترجمہ: نہیں ہیں محمد (فداہ روحی) کسی کے باپ تمہارے مردوں میں سے بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

یعنی حضور ﷺ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں جب آپ باپ نہیں ہیں تو ''زید'' بیٹا کیسے بن گیا۔ وہ تو اپنے باپ حارثہ کا بیٹا ہے لہٰذا یہود و نصاریٰ ! تمہارا یہ اعتراض تمہارے خبث باطن کی پیداوار ہے حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

بہر صورت یہ نکاح جاہلیت کی اس قبیح رسم کو ختم کرنے کیلئے تھا اور خود اللہ تعالیٰ کے حکم اور حکمت کے مطابق تھا جنسی جذبے کی تسکین کیلئے نہ تھا جیسا کہ بعض بد باطن

مستشرقین کا خیال ہے امام بخاری کی روایت کے مطابق حضرت زینب رضی اللہ عنہا ازواج رسول کے سامنے فخراً کہا کرتی تھیں۔زوّجکنّ اھالیکنّ وزوّجنی اللّٰہ من فوق سبع سمٰوٰت (تمہارا نکاح تمہارے گھر والوں نے کیا اور میرا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان کے اوپر کیا)

اجتماعی حکمت:

یہ حکمت اس وقت ظاہر ہوئی جب حضور سیّد عالم ﷺ نے اپنے جانثار ساتھی حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور وفادار صحابی حضرت سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیوں سے نکاح کیا اس تعلّق کے پیدا کرنے میں جہاں اپنے ان غلاموں کی دلجوئی مقصود تھی وہاں قریش سے نسب اور مصاہرت کے تعلقات بھی استوار کرنے کی حکمت پیش نظر تھی تاکہ اعلاء کلمة الحق میں یہ لوگ ممدومعاون ثابت ہوں سیّد عالم ﷺ نے جس خاتون کو سب سے پہلے شرف زوجیّت بخشا ان کا اسم گرامی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہے اس وقت حضور ﷺ کا عنفوان شباب تھا عمر مبارک پچیس سال تھی حضرت خدیجہ دوبار بیوہ ہونے کے بعد اپنے چالیسویں سال میں تھیں لیکن ان کے ساتھ زوجیّت کے تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ ان کے وصال تک حضور ﷺ نے کسی دوسری بیوی کا کبھی خیال بھی نہیں فرمایا اور ان کے وصال کے بعد بھی اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے یہاں تک کہ حضرت عائشہ بھی رشک کرنے لگتیں حضرت خدیجہ کے وصال کے بعد ایک سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ بنت زمعہ سے نکاح فرمایا حضرت عائشہ سے عقد اگر چہ ہجرت سے پہلے ہو چکا تھا لیکن رخصتی

ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت فاروق اعظم کی صاحبزادی تھیں جن کی شادی خنیس بن حذافہ سے ہوئی تھی وہ احد میں شدید زخمی ہوئے اور زخموں کی تاب نہ لاکر مدینہ طیبہ میں وفات پائی حضرت عمر اپنی صاحبزادی کے مستقبل کے متعلق بڑے پریشان تھے حضور ﷺ کا انہیں شرف زوجیت بخشنا نہ صرف ان کی دلجوئی کا باعث ہوا بلکہ اس سے حضرت فاروق اعظم کی بہت بڑی پریشانی دور ہوئی حضور کی جتنی شادیاں ہوئی ان سے دین کی تبلیغ اور اس کی اشاعت میں بڑا فائدہ ہوا ان سے مقصود یا تو اپنے غلاموں کی دلجوئی تھی یا دشمن قبائل کے ساتھ محبت اور مؤدت کے تعلقات قائم کرنے تھے۔ ان شادیوں سے کسی شادی کو عزت کوشی کی علامت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اب آخر میں تعدد ازواج کی سیاسی حکمت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سیاسی حکمت:

سیّد عالم ﷺ نے بعض ازواج مطہرات سے نکاح محض اس لئے فرمایا کہ ان کی تالیف قلب مقصود تھی اور ان کے قبائل کی اسلام دشمنی کم کرنے اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کی پالیسی پیش نظر تھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالد بن ولید کا تعلق تھا اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ابو سفیان کی بیٹی تھیں ان شادیوں نے بڑی حد تک ان خاندانوں میں دشمنی کا زور توڑ دیا بلکہ حضرت ام حبیبہ کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضور کے مقابلے پر نہ آئے حضرت صفیہ، حضرت جویریہ اور حضرت ریحانہ یہودی

خاندان سے تھیں انہیں آزاد کر کے جب حضور نے ان سے نکاح کئے تو آپ ﷺ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اس زمانے کی عربی روایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی یہ مصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی پاک ﷺ کے لئے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے تاکہ جو کارِ عظیم آپ کے سپرد کیا گیا تھا اس کی ضروریات کے لحاظ سے آپ جتنے نکاح کرنا چاہیں کرلیں۔

ذیل میں اس مسئلہ کی توضیح کیلئے چند حقائق کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

1: جب سید عالم ﷺ نے حضرت جویریہ بنت الحارث سے نکاح کیا (حارث جو بنی المصطلق کے سردار تھے) حضرت جویریہ اپنی قوم اور قبیلے کے افراد کے ساتھ قیدی ہو کر "مدینہ منورہ" بارگاہ رسول میں پہنچی تھیں فدیہ کی رقم دیکر رہائی پانے کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے پاس مالی مدد کے حصول کیلئے حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا تیرا فدیہ میں ادا کئے دیتا ہوں اور اس کے بعد تم میرے ساتھ نکاح کرلو یہ شرط انہوں نے بطیب خاطر قبول کر لی اور حضور ﷺ کے ساتھ آپ کا نکاح ہو گیا تو آپ کے قبیلے کے وہ افراد جو مسلمانوں کی قید میں تھے ان کے متعلق مسلمانوں نے کہا اصھار رسول اللہ تحت أیدینا۔ رسول اللہ ﷺ کے سسرال ہمارے قیدی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوری طور پر تمام قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

بنی مصطلق نے جب اس مروّت اور فیاضی کو دیکھا تو تمام لوگ کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام میں داخل ہو گئے یہ نکاح نہ صرف حضرت جویریہ بلکہ ان کے تمام

قبیلے کیلئے خیر و برکت اور اسلام و ایمان کا باعث ثابت ہوا اس ایمان افروز حقیقت کو امام بخاری نے صحیح بخاری میں یوں بیان کیا ہے۔

''سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ بنی مصطلق کی عورتیں جب قید ہو کر بارگاہ رسول اللہ ﷺ میں آئیں تو آپ نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ نکال کر باقی تمام مال مجاہدین میں تقسیم فرمادیا سواری والے کو دو اور پیادہ کو ایک حصہ عطا کیا جویریہ بنت الحارث حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یارسول اللہ میں اپنی قوم کے سردار حارث کی بیٹی ہوں اور میں جس امتحان سے دوچار ہوں آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں ثابت بن قیس نے میری آزادی کیلئے نو اوقیہ کی شرط رکھی ہے آپ مجھے آزاد کرانے میں میری مدد فرمائیں آپ نے فرمایا اگر اس سے بھی بہتر صورت پیدا ہو جائے تو۔ تو انہوں نے عرض کیا وہ کون سی آپ نے فرمایا تیری مکاتبت کی رقم میں ادا کر دوں اور تیرے ساتھ نکاح کر لوں انہوں نے یہ جواب سن کر رضامندی کا اظہار کر دیا جب یہ خبر صحابہ کرام تک پہنچی تو انہوں نے کہا رسول اللہ کے سسرال کو غلام بنایا جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے بنی مصطلق کے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا اس نکاح سے ایک سو خاندان تک آزادی کی نعمت پہنچی''

2: غزوہ خیبر میں حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب اپنے شوہر کے قتل ہو جانے کے بعد جب مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ایک مجاہد صحابی کے حصے میں آئیں تو کچھ ذمہ دار صحابہ نے ان کے معاملے میں غور و فکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ خاتون بنی قریظہ کی سردار ہے اسے دو عالم کے سردار ﷺ کے گھر کی زینت بننا ہی مناسب نظر آتا ہے

جب یہ بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گوش اقدس تک پہنچی تو آپ نے انہیں اپنے پاس بلا کر فرمایا کہ دو چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو ہم تمہیں آزاد کئے دیتے ہیں اس کے بعد تم میری رفیقہ حیات بھی بن سکتی ہو اور اپنے عزیز و اقارب کے پاس واپس جانے کا بھی تجھے اختیار ہے تو حضرت صفیہ نے پہلی بات کو پسند کرتے ہوئے کہا کہ میں آزادی کی دولت میسر آنے کے بعد ہمیشہ کیلئے آپ کی غلامی میں رہنا پسند کرتی ہوں آپ کے اسلام لانے اور کاشانہ نبوت میں داخل ہونے کے باعث آپ کے قبیلے کی کثیر تعداد دولت اسلام سے مالا مال ہوگئی۔

3: سیدہ اُم حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا رشتہ ازدواج بھی اسلامی مشن کی ترویج واشاعت اور ان کے ایثار کے صلے کے طور پر منعقد ہوا تھا آپ کے والد ابوسفیان جب وہ کفر وشرک کے علم بردار اور اسلام اور ہادی اسلام ﷺ کے بدترین دشمنوں میں سے تھے حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے دولت ایمان سے نوازا تو آپ نے دین وایمان کے تحفظ کیلئے اپنے شوہر سمیت مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی وہاں جا کر آپ کے شوہر انتقال کر گئے تو آپ کو مسافری، غربت اور تنہائی کے امتحان سے دوچار ہونا پڑا جب نبی اکرم ﷺ کو آپ کے حالات کی خبر ہوئی تو آپ نے نجاشی (شاہ حبشہ) کو پیغام بھیجا کہ تم اُم حبیبہ کا نکاح میرے ساتھ کر دو جب نجاشی نے حضرت اُم حبیبہ کو اس معاملے سے آگاہ کیا تو انہیں بے انتہا خوشی ہوئی اور انہوں نے فوری طور پر رضامندی کا اظہار کر دیا آپ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر مجھے واپس مکہ لوٹنا پڑا تو میرا باپ اور میرے گھر والے مجھے کفر وارتداد پر مجبور کریں گے یا سخت قسم کی اذیت دیں گے۔ حضرت نجاشی نے

آپ کو مہر کے طور پر چار سو دینار اور بہت سے قیمتی تحائف بھی عنایت کئے جب اُبو سفیان کو اپنی بیٹی کے اس نکاح کی خبر ملی تو انہوں نے اس تعلق کو برقرار رکھتے ہوئے صرف اتنا کہا'' ھو الفحل لا یقدح انفه '' وہ ایسا شہ زور اور بلند ہمت نر ہے جسے نکیل نہیں ڈالی جاسکتی اس واقعہ کے بعد اُبو سفیان کی اسلام دشمنی کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کی اذیت و دلآزاری میں کافی حد تک کمی واقع ہوگئی بالآخر اللہ تعالیٰ نے اُبو سفیان کے دل میں ہدایت کی شمع روشن فرمادی اور وہ ایک مخلص اور جانثار صحابی بن کر رسول اللہ ﷺ کے حلقہ غلامی میں داخل ہو گئے۔

ازواج مطہّرات کی قبائلی حیثیت

1:	حضرت خدیجہ	قریش (بنی اسد)
2:	حضرت سودہ	قریش (بنو عامر)
3:	حضرت عائشہ	قریش (بنو تمیم)
4:	حضرت حفصہ	قریش (بنو عدی)
5:	حضرت اُم سلمہ بنت مغیرہ	قریش (بنو مخزوم)
6:	حضرت اُم حبیبہ	قریش (بنو امیّہ)
7:	حضرت زینب بنت خزیمہ	(بنو عامر بن صعصہ)
8:	حضرت میمونہ بنت حارث	(بنو عامر بن صعصہ)
9:	حضرت زینب بنت جحش	(بنو اسد بن خزیمہ)
10:	حضرت جویریہ خزاعی	(بنو یہود)

11: جناب حضرت صفیہ بنت حیی (بنو یہود)

ازواج مطہرات کی مذکورہ بالا قبائلی حیثیت پر بہ ادنیٰ تامل یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کی حیثیت سیاسی تھی اس فہرست میں سے چھ خواتین کا تعلق قریش سے تھا اور یہی وہ لوگ تھے جو اسلام کی مخالفت میں تمام قبائل کے امام تھے۔ چنانچہ جب ان کی عداوت کی اٹھتی آندھی اتری اور بغض وعناد کے ہلاکت خیز طوفان تھمے تو دیکھتے ہی دیکھتے تمام عرب حلقہ بگوشان اسلام میں شامل ہوگیا امہات المؤمنین میں سے دو کا تعلق یہود سے تھا ہر چند کہ یہ قبائل حجاز سے نکل گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی معتد بہ تعداد ابھی اس کے نواح میں موجود تھی ان کے دلوں سے عناد کی کدورت کو مٹانے اور اسلام کے قریب تر لانے کیلئے رشتہ مصاہرت کے اثر کو آزمانا بھی لازمی تھا۔

غیر مسلموں کا اعتراض

غیر مسلم تذکرہ نگار جنہیں اپنی کم فہمی کے صدقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ادا پسند نہیں آتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے اس پہلو پر کہ آپ نے متعدد خواتین سے نکاح کیا۔ معترض ہوتے ہیں اور نعوذ باللہ اسے عیاشی کے مکروہ نام سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو آپ کے دستور العمل میں یہ تبدیلی حالات اور واقعات کا فطری تقاضہ تھی۔ کیونکہ مکی زندگی میں تبلیغ اسلام پر جو پابندیاں عائد تھیں اور مسلمان جن ناگفتہ بہ حالات میں گھرے ہوئے تھے وہاں آپ کی سرگرمیوں کا دائرہ اتنا محدود تھا کہ آپ بنفس نفیس اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے۔

مدنی زندگی میں جب تبلیغ دین کے راستوں میں کوئی رکاوٹ حائل نہ رہ گئی اور لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں شامل ہونے لگ گئے تو آپ کی مصروفیات اتنی پھیل گئیں کہ صنف نازک کو تعلیم احکام شرع کیلئے آپ کے پاس فرصت کی گنجائش نہ رہی ان حالات میں آپ کو ایسی ٹیم درکار تھی جو دین کو من وعن اپنی ہم جنسوں تک پہنچا سکے اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو قابل قدر خدمات انجام دیں اس کے احاطے کیلئے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔

جواب:

حضور اکرم ﷺ نے جناب حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پچیس برس کی عمر میں نکاح فرمایا اور جوانی کی پچیس بہاریں اس ہمہ تن ایثار خاتون محترمہ کی رفاقت میں گزار دیں جب ہجرت کر کے مدینے آئے تو شباب کی بہار کب کی رخصت ہو چکی تھی اس میں شبہ نہیں کہ اس منزل پر یکے بعد دیگرے آپ نے کئی نکاح فرمائے ہیں۔ یہ اقدام کسی نفسانی خواہش کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا کیونکہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہر انسان کے دل و دماغ کی دنیا بدل جاتی ہے اور بڑے بڑے رِند قسم کے لوگ بھی اپنے طور طریقے درست کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ایسا مصلح جس کی زندگی کے ہر شعبے میں توازن موجود ہے وہ ان اخلاقی ضابطوں کے خلاف جن پر وہ ترپین ۵۳ برس کار بند رہا ہو بیک جنبش بغاوت کر دے۔ کیا اخلاق فاضلہ کی زنجیر اتنی کمزور ہے کہ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جاتی ہے۔

عبد الرسول منصور الازہری 2002ء

صدقات
رسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ ﷺ کی املاک وصدقات کی کل تعداد کیا تھی تفصیل درکار ہے

والسلام

سید عابد علی شاہ

معلم گورنمنٹ ہائی سکول 134/9.L

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ ﷺ نے جب وصال فرمایا اس وقت جو صدقات واملاک آپ کے ملک وتحویل میں تھے ان کی کل تعداد آٹھ بتائی جاتی ہے ذیل میں ان کی تفصیلات دی جارہی ہیں۔

1: زمین وصیّت:

یہ وہ قطعہ ارض ہے جو بنی نضیر کے اموال سے یہود کے ممتاز عالم دین حضرت مخیریق نے ایک وصیت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں پیش کیا امام واقدی رحمہ اللہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مخیریق جو بنی نضیر یہودیوں کے معروف اور ممتاز عالم اور مذہبی رہنما تھے۔غزوہ احد کے روز پیغمبر اسلام رسول اللہ ﷺ پر برضاء ورغبت ایمان لائے اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے اس وقت ان کی ملکیت میں سات باغات تھے جن کے نام یہ ہیں۔ المبیت ، الصافیہ ، الدّلالْ ،جسنی ، برقہ ، الاعراف ، المربد

انہوں نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی وصیت کے مطابق یہ تمام باغات رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں نذر کر دیئے اور آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں جہاد و قتال کرتے ہوئے شہید ہوئے رضی اللہ عنہ

2: مدینہ میں بنی نضیر کی زمین:

مدینہ منورہ میں بنی نضیر کی یہ وہ پہلی زمین تھی جو اللہ تعالیٰ نے بطور مال غنیمت اپنے رسول ﷺ کو عطا فرمائی مستند روایات واحادیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے یہود بنی نضیر کو اس زمین سے نکل جانے کا حکم دیا اور ان کی خون ریزی کئے بغیر ان سے کہا کہ سامان حرب وضرب اسلحہ کے علاوہ جتنا مال ومتاع وہ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں ان سے کسی قسم کا تعرض نہ ہوگا چنانچہ وہ حتی الامکان اپنا سامان اونٹوں پر لاد کر خیبر وشام کی طرف چلے گئے اور ان کی متروکہ تمام زمین رسول اللہ ﷺ کی ملکیت قرار پائی۔ البتہ یامین بن عمیر اور ابو سعد بن وھب جو اس واقعہ سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے ان کی جائیداد واملاک ان کے پاس ہی رہی چنانچہ آپ ﷺ نے اس زمین کے علاوہ ان کے تمام اُموال وامتاع کو انصار مدینہ کے سوا اوائل مہاجرین مکہ میں تقسیم کر دیا البتہ حضرت سہل بن حنیف اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ انصاری جنہوں نے آپ کے سامنے اپنے فقر واحتیاج کا ذکر کیا تو آپ نے اس مال سے انہیں بھی کچھ حصہ عطا فرمایا۔ بنی نضیر کی وہ متروکہ زمین آپ کی ملکیت میں رہی۔

آپ اس کی پیداوار کو اپنی ازواج مطہرات کے علاوہ دیگر صوابدیدی اختیار کے مطابق مدوں پر صرف کرتے رہے۔ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا

دورِ خلافت آیا تو آپ نے وہ زمین حضرت علی المرتضی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد کردی کہ وہ از خود اسے اس کے مصرف میں خرچ کریں۔

5,4,3: خیبر کے تین قلعے:

خیبر میں کل آٹھ قلعے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ ناعم، قموص، شق، نطاۃ، کتیبہ، وطیح، سلالم، حصن صعب بن معاذ: ان میں سب سے پہلا قلعہ جو نبی کریم ﷺ نے فتح کیا وہ ناعم تھا اس موقعہ پر محمد بن مسلمہ کا بھائی محمود بن مسلمہ بھی قتل ہوا تھا دوسرے نمبر پر قموص جو حصن ابن ابوالحقیق کے نام سے معروف تھا آپ نے فتح کیا اس موقعہ پر جو افراد قیدی ہوئے ان میں صفیہ بنت حیی بن اُخطب بھی شامل تھیں یہ کنانہ بن ربیع بن اُبی الحقیق کے عقد میں تھیں جنہیں آپ نے اپنے لئے پسند فرمایا اور آزاد کر کے اپنے عقد نکاح میں داخل کرلیا۔

تیسرے نمبر پر حصن صعب بن معاذ فتح ہوا خیبر کے قلعوں میں یہ سب سے بڑا قلعہ تھا اس میں مال طعام اور حیوانات کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی۔ پھر شق، نطاۃ اور کتیبہ فتح ہوئے یہ چھ قلعے ایسے تھے جو طاقت اور بڑائی سے فتح ہوئے۔ پھر وطیح اور سلالم یہ فتوحات خیبر میں وہ آخری قلعے تھے جو کچھ راتوں کے محاصرہ کے بعد صلح کے ساتھ فتح ہوئے ان آٹھ قلعوں سے تین قلعے کتیبہ، وطیح، سلالم نبی کریم ﷺ کے ملک خاص میں آئے کتیبہ تو مال غنیمت کے خمس کے طور پر آپ کی ملکیت ٹھہرا وطیح اور سلالم کو آپ نے صلح سے فتح فرمایا اس لئے یہ دونوں بھی اللہ نے آپ کو عطا فرمادیئے بہر حال خیبر کے قلعوں میں غنیمت اور خمس کے طور پر یہ تینوں قلعے آپ کی ملکیت تھے باقی پانچ

قلعوں کو آپ نے حملہ آور غانمین میں تقسیم فرمادیا۔

اس موقعہ پر آپ نے وادی خیبر وادی سریرا اور وادی حاضر کو اٹھارہ حصوں میں حاضر و غائب اہل حدیبیہ جن کی تعداد ایک ہزار اور چار سو تھی پر تقسیم کردیا۔

6: نصف فدک:

جب نبی کریم ﷺ نے خیبر فتح کیا تو اہل فدک نے محیصہ بن مسعود کی سفارت کے ذریعے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر مصالحت کرلی اور طے یہ پایا کہ ہماری نصف زمین اور کھجوروں کے باغات کا آدھا حصہ آپ کا ہوگا اور باقی نصف ہمارا رہے گا۔

بایں طور اس زمین اور کھجوروں کا نصف حصہ آپ ﷺ کی ملکیت میں آ گیا مگر جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حجاز سے اہل ذمہ کو جلاوطن کیا تو ان میں اہل فدک بھی شامل تھے۔ آپ نے فدک کی قیمت ڈلوائی جو ایک لاکھ اور بیس ہزار بنی چنانچہ آپ نے نصف فدک کی قیمت ساٹھ ہزار درہم ان کے سپرد کردی یہ قیمت مالک بن تیہان سہل بن ابوحثمہ اور زید بن ثابت نے ڈالی تھی اس خریداری کے بعد فدک کا نصف تو رسول اللہ ﷺ کا صدقہ رہا اور باقی نصف تمام مسلمانوں کی ضروریات کیلئے وقف کردیا گیا۔

7: وادی قریٰ کا ثلث:

وادی قریٰ کی زمین کی ایک تہائی بنی عذرہ اور دو تہائی یہودیوں کی ملکیت تھی جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے مصالحت کی تو ایک تہائی آپ کی ملکیت میں دے

دی گئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک اس زمین کی یہی حیثیت رہی۔

8: مدینہ منورہ میں پلاٹ:

مدینۃ الرسول ﷺ کے بازار میں مھروذ نام کا ایک پلاٹ بھی آپ کی ملکیت تھا جسے مروان نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے حاصل کرلیا تھا۔ یہ وہ آٹھ صدقات تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ملک تام میں تھے ان کی تفصیلات اہل سیر و مغازی کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔(۱)

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

عبدالرسول منصور الازہری

8 جولائی 2003ء

---

(۱) بحوالہ احکام سلطانیہ فی ولایات دینیہ امام ابوالحسن بصری بغدادی الماوردی متوفی ۴۵۰ھ

اجتہادِ رسول ﷺ
اور
عبداللہ بن ابیؔ
کی نمازِ جنازہ
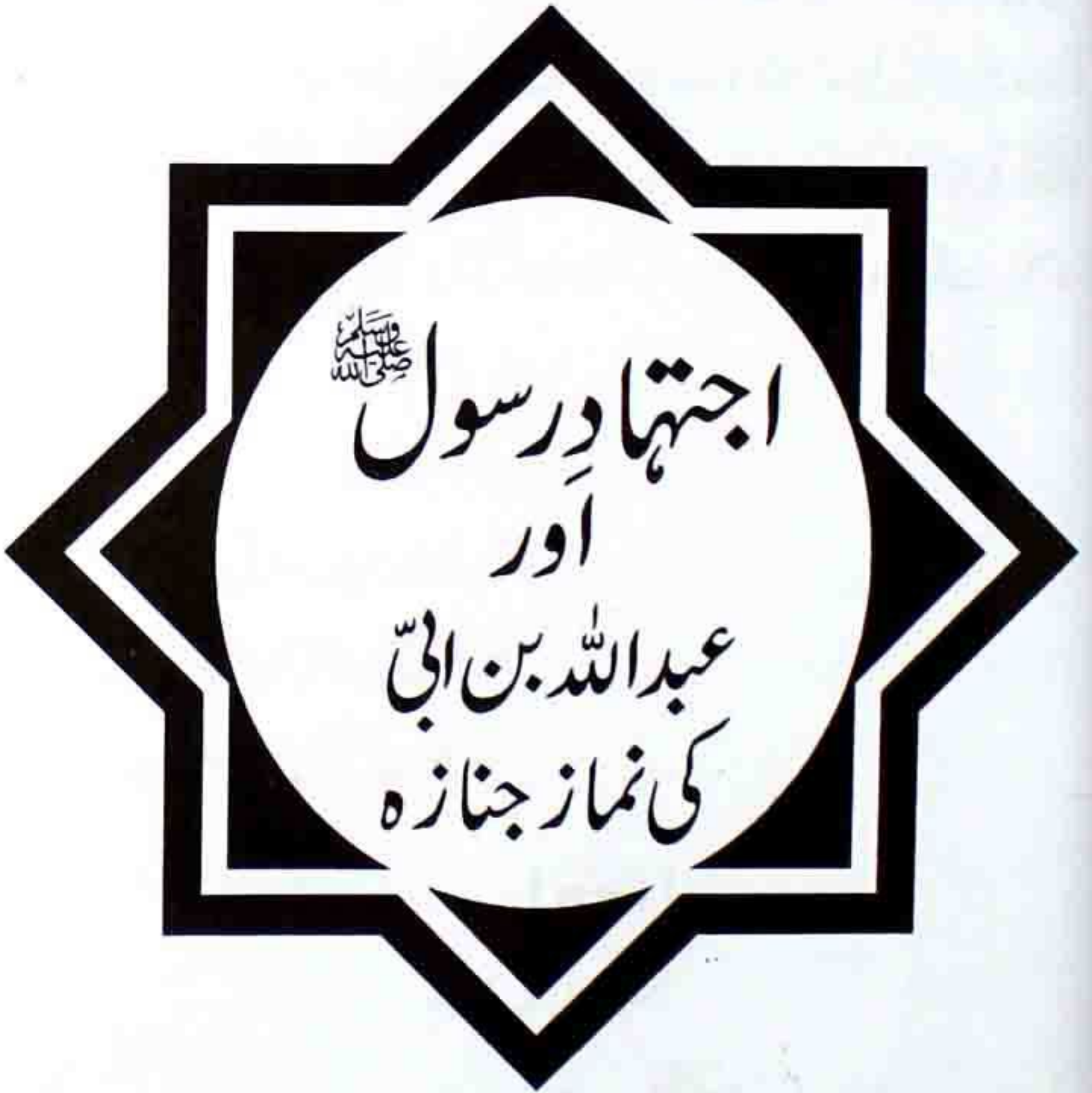
رسول اللہ ﷺ نے مشہور منافق مدینہ عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ کیوں پڑھی جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرمادیا تھا۔

کیا نبی اکرم ﷺ کو وحی الٰہی کے باوجود اجتہاد کا حق حاصل ہے؟

مذکورہ بالا منافق کی نماز جنازہ کے معاملے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی مخالفت کی تو کیا احکامات شرعیہ میں کسی کو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا حق حاصل ہے شرح وبسط کے ساتھ مسئلہ اجتہاد کو واضح فرمائیں

والسلام

حافظ محمد حنیف وارثی

مہتمم جامعہ فیض القرآن ٹھنڈی کھوئی

ریلوے اسٹیشن ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتہاد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أنه قال لما توفّی عبداللّٰه ابن أبیّ بن سلول جاء ابنه عبداللّٰه الی رسول ال للّٰه ﷺ فسأله أن یعطیه قمیصه یکفّن فیه أباه فأعطاه ثم سأله أن یصلّی علیه فقام رسول اللّٰه

صلی اللہ علیہ وسلم لیصلّی علیه فقام عمر فأخذ بثوب النّبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللّٰه تصلّی علیه وقد نهاک ربّک فقال صلی اللہ علیہ وسلم انّما خیّرنی اللّٰه فقال اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۱)

وسأ زیده علی السّبعین قال عمر انّه منافق قال فصلی علیه رسول فأنزل اللّٰه عزّوجلّ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی بن سلول فوت ہو ا تو اس کا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے آپ کا کرتہ مبارک مانگا کہ وہ اسے اپنے باپ کے کفن میں استعمال کرے آپ نے اسے اپنا کرتہ مبارک عطا کر دیا پھر اس نے آپ سے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز جنازہ پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر آپ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں جبکہ آپ کے رب نے تو آپ کو منع فرمایا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا اصل بات یہ ہے کہ میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے اس کا قول ہے کہ تم ان کی معافی چاہو یا نہ چاہو اگر تم ستر بار ان کی معافی چاہو تو اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا۔ مگر میں ستر سے بھی زائد بار معافی

(۱) التوبہ۸۰ (۲) التوبہ: ۸۴ بخاری ومسلم

چاہوں گا حضرت عمر نے کہا یہ تو منافق ہے۔ جب آپ نے اس پر نماز پڑھ لی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ''اوران میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا:

اس حدیث مبارکہ کی شرح سے چند باتیں سامنے آتی ہیں

(۱) کیا یہ حدیث اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے نزول وحی سے پہلے احکام شریعت میں اجتہاد کرنا جائز ہے۔

(۲) جب رسول کے لئے اجتہاد کرنا جائز ہے تو پھر وحی الٰہی کے ساتھ اس کے اتصال کا کیا فائدہ کیا یہ اولیٰ وافضل نہیں کہ وہ تمام احکام کو وحی کی روشنی میں ہی اپنائے

(۳) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اجتہاد میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی تو کیا کسی شرعی حکم میں کسی کو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا حق ملتا ہے اندریں صورت اس آیہ مبارکہ کیساتھ یہ حکم کیسے منطبق ہوگا۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۱)

اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو

(۴) رسول اللہ ﷺ نے اپنے اجتہاد کی بنیاد جس دلیل انما خیّرنی اللہ مجھے اللہ نے اختیار دیا ہے پر رکھی حدیث مبارک نے اسے واضح کردیا مگر حضرت عمر نے جس دلیل پر نبی اکرم ﷺ کو نماز پڑھنے سے منع کیا وہ کہاں ہے۔

(۵) بظاہر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو درست قرار دیتے

---

(۱) الحشر : ۷

ہوئے رسول اللہ ﷺ سے کہا وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (۱)

اوران میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا۔ تو اس میں کیا راز ہے؟

پہلے سوال کا جواب اثبات میں ہے کیونکہ حدیث مبارکہ میں ایک شرعی حکم میں نبی کریم ﷺ کا اجتہاد کرنا صراحۃً ثابت ہو رہا ہے اور متوفّی منافق پر نماز کا جواز اور عدم جواز یقیناً ایک شرعی حکم قرار پاتا ہے۔ پھر اس شرعی حکم میں آپ ﷺ کا یہ عمل وحی سے نہیں بلکہ اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے اسی لئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں آپ کی مخالفت کی اگر آپ کا یہ عمل وحی ربّانی کی بنیاد پر صادر ہوتا تو حضرت عمر اس مسئلہ پر آپ کی مخالفت نہ کرتے نیز اس سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ نبی اکرم ﷺ کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے اس موقعہ پر آپ نے عملاً اجتہاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس اجتہاد سے منع نہ فرمایا۔

شُبہ اور اس کا ازالہ

کچھ علماء اصول فقہ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں جس کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ مجتہد کی رائے میں خطاء اور صواب کا احتمال ہوتا ہے۔ اور یہ معنی رسول اللہ ﷺ میں نہیں پایا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کی اتباع ہم پر واجب قرار دی ہے۔ جو رسول لیکر مبعوث ہوتا ہے۔ اور اس کے اوامر و نواہی میں کسی کو بھی مخالفت کرنا جائز نہیں دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے احکام کی'

---

(۱) التوبہ : ۸۴

تبلیغ کرے اندریں حالت اسکی تمام شریعت من جانب اللہ نصوص پر مشتمل ہونی ضروری ہے کیونکہ مبلّغ کی شان اور مقام کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ وحی الٰہی پر ہی انحصار کرے مگر جب وہ اجتہاد سے کام لے گا تو وہ وظیفہ تبلیغ سے نکل کر وظیفہ اجتہاد میں داخل ہو جائے گا۔ جس کیلئے اسکی بعثت ہوئی ہی نہیں بناء بریں رسول اجتہاد کا حق نہیں رکھتا۔

ان دو دلیلوں کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ وحی ربّانی کے ساتھ ہی متصل اور منسلک ہیں مگر جب آپ اجتہاد میں خطا کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس خطاء پر قائم رہنے نہیں دیتا بلکہ وحی کے ذریعے آپ کو صواب اور صحیح حکم سے مطلع کر دیتا ہے جس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اسلئے آپ کے تمام احکام کی اتباع اور ان کی بجا آوری واجب قرار پاتی ہے جبکہ دیگر مجتہدین کا معاملہ آپ کے برعکس ہے تو رسول ﷺ کو بعض احکام کی ابتداء میں اگر چہ مجتہد کہا جا سکتا ہے مگر بعد میں آپ کے اجتہاد پر وحی کے نازل ہونے سے اس حکم میں آپ کی رائے قطعاً صحیح اور صواب قرار پا جاتی ہے جس میں وحی شدہ نص کی طرح خطاء کا کوئی احتمال نہیں ہوتا اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اجتہاد کرنے سے رسول وظیفہ تبلیغ سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ اقرار وحی سے اس کا اجتہاد بھی وحی شدہ نص کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔

آیات قرآنی سے اجتہاد رسول کا ثبوت

کتاب و سنّت سے کثیر دلائل سے رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کا ثبوت ملتا ہے ذیل میں چند آیات قرآنی پیش کی جا رہی ہیں۔

1: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱) کہ تم لوگوں سے بیان کردو جوان کی طرف اترا۔ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ بیان عام ہے جو وحی اور اجتہاد ہر دو طریقوں پر مشتمل ہے بلکہ اگر اسے طریق وحی پر ہی خاص کر دیا جائے تو اس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا کیونکہ طریق وحی سے بیان تو دیگر آیات قرآنی کے ضمن میں بھی سمجھا جارہا ہے اس لئے اس مقام پر بیان وحی کے علاوہ اجتہاد کو بھی شامل ہے۔

2: فَاعْتَبِرُوْا يَاأُولِي الْأَبْصَارِ (۲) تو عبرت سے کام لو اے نگاہ والو: اولی الأ بصار جنہیں اعتبار یعنی اجتہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں رسول اللہ ﷺ بھی شامل ہیں بلکہ آپ تو نظر و اعتبار میں اولی الأ بصار کے سردار قرار پاتے ہیں اس بنا پر دیگر اہل علم و نظر کی طرح آپ بھی اجتہاد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

3: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳) اور کاموں میں ان سے مشورہ لو: یہ آیہ مبارکہ بھی رسول اللہ ﷺ کے منصب اجتہاد پر فائز ہونے کا بیّن ثبوت پیش کر رہی ہے کیونکہ اگر آپ امور و معاملات میں اپنی رائے فیصل ہی نہیں رکھتے تو آپ کو اپنے صحابہ سے مشورہ لینے پر حکم دینے کا کیا معنی کیونکہ جو کسی معاملہ میں اپنی کوئی حتمی رائے ہی نہیں رکھتا وہ کسی دوسرے سے مشاورت کرے اس میں کوئی وقعت اور حقیقت دکھائی نہیں دیتی نیز یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ رسول ﷺ کی اپنے اصحاب سے مشاورت تو سطحی اور ظاہری حد تک محدود تھی جس سے صرف ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے دلوں میں خوشی پیدا کرنا مقصود تھا یہ وہ تصور ہے جس سے اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جلیل

---

(۱) النحل : ۴۴ (۲) الحشر : ۲ (۳) آل عمران : ۱۵۹

القدر صحابہ قطعی منزّہ اور مبرا قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے کہ ایسی شوری کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا وہ تو محض انہیں خوش کرنے کیلئے رونما ہوتی تھی۔ تو پھر ان کی آپ ﷺ سے مخالفت کا کیا معنی جبکہ بہت سے مواقع وحوادث پر صحابہ کی آپ سے مخالفت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مخالفت اور موقف کو برقرار رکھنا بھی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ زیر بحث حدیث میں نبی کریم ﷺ کا اجتہاد اور اس پر حضرت عمر کی مخالفت کا پہلو نمایاں نظر آرہا ہے کہ اس شرعی حکم پر آپ نے عملاً اجتہاد کیا حضرت عمر نے اپنی مخالفت ظاہر کی اللہ تعالیٰ نے بظاہر آپ کے اجتہاد کو برقرار رکھا اور نبی کریم ﷺ کو اجتہاد کرنے سے منع بھی نہ فرمایا ایسی بہت سی مثالیں سنت نبویہ میں دکھائی دیتی ہیں قرآن مجید سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ (۱)

”کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے“ اس آیہ مبارکہ کے شان نزول کا خلاصہ یہ ہے کہ غزوہ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں نے اہل مکہ کے جن ستر افراد کو قیدی بنایا ان میں رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس چچازاد بھائی عقیل بن ابو طالب اور مکہ کا عظیم فصیح و بلیغ شاعر سہیل بن عمر بھی شامل تھا ان اسیروں کے بارے مسلمانوں نے اختلاف رائے کیا نبی کریم ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور کچھ دیگر صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ ان سے مالی

---

(۱) الانفال : ۶۷

فدیہ وصول کر کے چھوڑ دیا جائے حضرت عمر حضرت سعد بن معاذ اور ان کے ساتھ کچھ صحابہ کا موقف یہ تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے بظاہر یہ آیت کریمہ حضرت عمر اور آپ کے ہم خیال ساتھیوں کی تائید کر رہی ہے مگر فی الواقع اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کی تائید فرمادی اسکی تفصیل کچھ یوں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں اس وقت کی حربی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ محاربین اور اعداء اسلام کی بیخ کنی کر دی جائے اور مالی فدیہ کے عوض ان اسیروں کو رہائی نہ دی جائے خصوصاً ایسے اسیروں کی جاں بخشی کرنا جو اپنے معاشرے میں زبردست اثر و رسوخ کے حامل ہوں قرین قیاس دکھائی نہیں دیتا دعوت الی اللہ کے اس ابتدائی دور اور مسلمانوں کی ضعف و کمزوری کی حالت میں اس اقدام سے وہ عظیم شر پیدا ہوگا کہ کثیر مال بھی اس کا تدارک نہ کر سکے گا اس لئے اُولی و افضل یہی ہے کہ مشرکین کو مرعوب کرنے کیلئے کفر کے ان سرداروں کو قتل کر دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ ان اسیروں کے قتل کرنے میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان کے قتل سے ان کے احباب و اقارب کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہوگا جس سے مسلمانوں کی صورتحال مزید بدتری کا شکار ہوگی جبکہ دین اسلام کی فطرت کو قتل و بطش کی بجائے دلیل و برہان پر استوار کیا گیا ہے نیز ان اسیروں میں بہت سے ایسے اسیر بھی ہیں جو صحیح ادراک اور ہدایت حق پر آمادہ بھی نظر آتے ہیں عین ممکن ہے یہ لوگ اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان لا کر دین حق کیلئے عظیم قوت ثابت ہوں اور دعوت الی اللہ کی اصل غرض اور اس کا حقیقی ہدف بھی یہی ہے پھر اس وقت مسلمان معاشی طور پر سخت پریشانی کا شکار ہیں اس مال وفدیہ سے وہ اپنی

معاشی حالت بھی بہتر بنا سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان اسیروں کی کثیر تعداد نے دین اسلام قبول کر کے دین حق کی قوت وشوکت میں بے پناہ اضافہ کیا۔

سیرت نبویہ کی کتب میں مرقوم ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ سہیل بن عمر نے اپنی فصاحت وخطابت سے مسلمانوں کو سخت اذیت دی ہے ایک اچھی تجویز یہ ہے کہ اس کے کچھ دانت توڑ دیئے جائیں جس سے اسکی زبان میں تعطل وخلل پیدا ہو جائے اور یہ ایک فصیح خطیب کے مقام پر کھڑا ہونے سے شرمائے تو آپ ﷺ نے فرمایا عسیٰ أن یقوم مقاما تمدحه علیه ''عنقریب وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوگا کہ تو بھی اسکی مدح کرے گا'' چنانچہ آپ نے اسے فدیہ لیکر رہا کر دیا کچھ عرصہ بعد سہیل بن عمر اسلام قبول کر کے دین حق کا عظیم خادم قرار پایا رضی اللہ عنہ۔ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور بعض ضعیف الایمان مسلمانوں نے دین اسلام سے ارتداد کا ارادہ کیا تو سہیل بن عمر نے انہیں جمع کر کے ایسا فصیح وبلیغ خطبہ دیا کہ وہ اپنے اس ناپاک عزم وارادے سے تائب ہو گئے اس مقام پر حضرت عمر نے سہیل بن عمر کی مدح سرائی کی اور ان کی خدمات کو خوب سراہا اور یوں رسول اللہ ﷺ کی سیاسی بصیرت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی

علیه آلاف آلاف سلام

اس مسئلہ پر یہ دو آراء تھیں جنہیں قدرے تفصیل کے ساتھ اس مضمون میں بیان کر دیا گیا اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں کے احوال وکوائف سے اچھی طرح آگاہ ہے اس نے فی الواقع دونوں فریقوں کی تائید کر دی بایں طور کہ اس نے قیدیوں کو رہائی دینے اور ان سے فدیہ لینے میں رسول اللہ ﷺ کی سیاست کو برقرار رکھا کیونکہ اگر اس

نے ان کے قتل اور ان سے فدیہ نہ لینے کا ارادہ کیا ہوتا تو وہ اس اقدام سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی فرما کر آپ کو اس کام سے منع کر دیتا جب کہ بعض مواقع پر جب آپ نے بعض کبیر اور امیر مشرکین کے ایمان و اسلام کی حرص پر جب کمزور اور فقیر مسلمانوں کو مجلس سے دور کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل کر کے آپ کو ایسا کرنے سے منع کر دیا چنانچہ آپ ایسا کرنے سے باز رہے۔ مگر اسیران بدر کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ایسا نہ کیا کیونکہ ان سے فدیہ لیکر ان کے آزاد کرنے پر جو خیر کثیر مرتب ہونے والی تھی وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا اسی لئے اس نے اپنے رسول ﷺ کو تنفیذ اجتہاد سے منع نہ کیا اور اگر وہ چاہتا تو آپ کی طرف وحی کر کے آپ کو اس اقدام سے منع کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس فدیئے سے اہل اسلام کو نفع اٹھانا بھی جائز و مباح قرار دے دیا مگر یہ حالت صرف اس رسول کے ساتھ ہی خاص ہے جو وحی الٰہی سے متصل و منسلک ہے اور اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو نافذ العمل کر سکے دیگر مسلمانوں کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان کلمات سے خطاب فرمایا مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (۱)

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے۔ یعنی قتل کفار میں مبالغہ کر کے کفر کی ذلت اور اسلام کی شوکت کا اظہار نہ کرے۔ علامہ عبدالرحمان الجزیری رحمہ اللہ اس آیت کا معنی یہ لکھتے ہیں کہ کسی

---

(۱) الانفال

نبی کو لائق نہیں کہ وہ مشرکین سے فدیہ لیکر انہیں رہا کردے جب تک کہ ان کی اچھی طرح خون ریزی نہ کرے حتی کہ ان کی ذلت اور دین اسلام کی عزت وشوکت کا اظہار نہ ہو جائے ایسی صورتحال کے رونما ہو جانے پر اسے یہ طرز عمل زیب دیتا ہے کہ وہ ان سے فدیہ لے کر یا فدیہ لئے بغیر بھی چھوڑ دے چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی قوت وشوکت کے اُبھرنے پر قیدیوں کے معاملے میں مسلمانوں کو اختیار دے دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۱)

پھر اس کے بعد چاہے احسان کر کے چھوڑ دو چاہے فدیہ لے لو۔

بہر حال سورہ انفال کی مندرجہ بالا آیت مبارک بظاہر حضرت عمر اور آپ کے ہم خیال اُصحاب کی تائید کر رہی ہے گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرما رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق اور آپ کے ساتھیوں کی سیاست اور حکمت عملی فی ذاتہ حسن اور خوب ہے مگر قبل از وقت ہے تاہم جب رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنایا ہے تو اس میں ضرر اور حرج بھی نہیں کہ اس پر مستقبل میں عظیم فائدہ مترتّب ہونے والا ہے مگر وہ فائدہ کوئی عادی اور معمول کے مطابق نہیں اسے صرف وہ خدا ہی جانتا ہے جو اپنے رسول کو اس سے منع نہیں کر رہا مگر حضرت عمر اور آپ کے ساتھیوں کی سیاست فطری اور طبعی قوانین کے مطابق ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اسی پر کاربند رہیں چنانچہ اس آیت مبارکہ میں خطاب رسول سے اہل اسلام کو انتباہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں اسی طرز عمل پر قائم رہیں (۲)

---

(۱) سورہ محمد : ۴ (۲) مجلۃ الازہر : ربیع النور ۱۳۲۴ھ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس وقت مشرکین مکہ کی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان ان کے ساتھ قوّت و شدّت سے پیش آتے کیونکہ مشرکین کے پاس مال و دولت اور افراد کی اکثریت تھی اور مسلمان ایک کمزور اقلیت میں تھے۔ اندریں حالات ان کے ساتھ سخت برتاؤ ہی مناسب تھا یہی وہ موقف تھا جسے حضرت عمر اور آپ کے ساتھیوں نے اپنایا اور یہی وہ انداز فکر ہے جو ہر مجتہد کیلئے ضروری قرار پاتا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کے دینی معاملات میں ان کی عام وخاص مصلحت ومنفعت کا پورا پورا خیال رکھے اور اپنے اجتہاد کی بنیاد ثابت شدہ حقائق پر استوار کرے۔ اور حربی امور تو خصوصاً ہر اعتبار سے شدت اور احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔

جہاں تک سورہ انفال کی اس آیت مبارکہ لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱)

''اگر اللہ پہلے ایک بات لکھ نہ چکا ہوتا تو اے مسلمانوں تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب آتا'' کے معنی کا تعلق ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجتہاد پر عمل کرنے والوں سے مواخذہ نہیں فرماتا اور یہاں صحابہ نے اجتہاد ہی تو کیا تھا اور ان کی فکر میں یہی بات آئی تھی کہ کافروں کو زندہ چھوڑ دینے میں ان کے اسلام لانے کی امید ہے اور فدیہ لینے میں دین کو تقویت ہوگی اور اس پر نظر نہیں گئی کہ قتل میں عزت اسلام اور تہدید کفار ہے تو روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ کچھ ایسے شرعی احکام بھی تھے جن میں آپ ﷺ نے وحی کے نازل ہونے سے

---

(۱) الانفال : ۶۸

پہلے اجتہاد کیا اس اجتہاد میں آپ کے کچھ اصحاب نے آپ کے مخالف رائے کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس اجتہادی رائے کو برقرار رکھا اور انہیں اس سے منع نہ کیا بلکہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ خطا پر مجتہد کو مواخذہ نہیں فرمائے گا اجتہاد رسول ﷺ کے جواز وثبوت پر یہ ایک قطعی اور بیّن دلیل ہے لاریب آپ سیّد المرسلین اور امام المجتہدین ہیں۔

دوسرے سوال کا جواب:

جب رسول اللہ ﷺ کا اتصال وحی الٰہی کے ساتھ ہے تو پھر آپ کے اجتہاد کا کیا فائدہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد رسول کے کئی فائدے ہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے اجتہاد کا ایک اہم فائدہ ان کے بعد آنے والے مجتہدین کیلئے عمدہ اور کامل نمونہ ہے کہ جب وہ مسائل میں اختلاف کریں خواہ ان مسائل کا تعلق معاملات سے ہو جیسا کہ اسیران بدر یا عبادات سے جیسا کہ منافق کی نماز جنازہ سے پیدا ہوا تھا ان کے اس اختلاف کی بنیاد اور اس کا دارومدار چار امور ہوں گے۔

1: مصلحت عامہ کو پیش نظر رکھنا اور ہر فریق کا یہی اعتقاد ہو کہ وہ اسی کی فکر و رائے میں موجود ہے۔

2: واضح دلائل سے اپنا موقف ثابت کرنا کہ ان دلائل کو سن کر انسان کو یقین آئے یہ سب کچھ اخلاص اور تقویٰ کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے۔

3: حق اور نتیجے کے ظاہر ہونے پر رائے میں عدم تعصب پایا جائے۔

4: نص کی عدم موجودگی میں اجتہاد کیا جائے اور نص کے پائے جانے پر اس

کے متبادر معنی کو اپناتے ہوئے اسی پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا اجتہاد جوان چار امور پر استوار ہو اہل اسلام کی اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں از حد ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قیامت تک کے تمام انسانوں کیلئے ہے حوادث کا تجدد اور زمانے اور ماحول کے تفاوت سے انسانی مصالح کا تفاوت بھی ایک فطری اور لازمی امر ہے۔ پھر نئے حوادث و مسائل کی دین کی خصوصی نصوص یا پھر عمومی نصوص سے تطبیق بھی انتہائی ضروری ہے نیز لوگوں کے افہام اور ان کی فکر و نظر کا کم و بیش ہونا بھی ایک مسلّم حقیقت ہے اسی لئے رسول اور اصحاب رسول ﷺ کا اجتہاد ضروری تھا۔ تاکہ ان کے بعد آنے والے مجتہدین کرام کیلئے یہ ایک کامل و احسن نمونہ قرار پائیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کے بغیر اجتہاد کرنے دیا تاکہ بعد والے مجتہدین ان کے اس طرز فکر سے استفادہ کر سکیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اجتہاد میں اپنا حکم نازل فرما کر ان پر واضح کر دیا کہ وہ بھی صواب و اصل حقیقت کی تلاش میں اپنی پوری علمی و فکری توانائی کو صرف کرتے رہیں بہر حال مجتہد وہی ہے جو احکام کے استنباط پر قادر ہو اور اس کا اجتہاد ایسی عام مصلحت کیلئے رونما ہو جس سے دین و ملت کا اعزاز و اکرام وابستہ نظر آئے۔ **فجزاھم اللّٰہ عن دینھم و نبیّھم احسن الجزاء**

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب اعلام الموقّعین میں لکھتے ہیں کہ شرعی نصوص ہر زمان و مکان کے جملہ احکام کو شامل ہیں ہر نئے مسئلے کا حکم کسی شرعی نص سے اخذ کرنا ممکن ہے مگر نص کے دو معنی ہیں ایک اصلی اور دوسرا اضافی اصلی معنی وہ ہے جو اس لفظ سے خود شارع کی مراد ہے اور اضافی وہ معنی ہے جسے سامع نے سمجھا ہے اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ لوگ فہم و ادراک میں ایک دوسرے

سے متفاوت ومختلف ہیں۔اور کلام کے اندر بھی بہت سی جہتیں اور کئی پہلو ہوتے ہیں جن کی وجہ سے فہم وادراک میں بھی اختلاف آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں بھی لوگ نصوص کی فہم وفقہ میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا کرتے تھے۔جب وہ آپ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تو آپ انہیں اس کے وہ معنی ارشاد فرماتے جو اللہ تعالیٰ کی منشاء ومراد ہوتے مگر اس کے باوجود آپ انہیں شارع کی مراد کے خلاف معنی کے فہم سے منع نہ کرتے فہم وادراک کا یہ تفاوت استنباط حکم اور جدید مسائل پر فتوٰی کے وقت نمایاں طور پر نظر آتا ہے کوئی اپنی فہم وذکاوت سے ایک ایسے صریح حکم کا استنباط کرلیتا ہے جو دوسرے پر کاملاً مخفی رہتا ہے۔جب کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے بھی یہ صورتحال پیش آئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ایک عورت جس نے صرف چھ ماہ کے بعد ایک بچے کو جنم دیا تھا اسے زانیہ قرار دیتے ہوئے سنگسار کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا کہ کلا انّ المرأة قد تلد لستّة أشهر ایسا مت سوچو کیونکہ عورت کبھی چھ ماہ پر بھی بچہ جنم دیتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی اس نص سے استدلال کیا وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۱)

اور اسے اٹھائے پھرنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینہ میں ہے۔اور اسکی توجیہہ یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (۲)

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس''

---

(۱) الاحقاف : ۱۵ (۲) بقرہ : ۲۳۳

جب تیس ماہ سے چوبیس ماہ نکال دیئے جائیں تو باقی چھ ماہ ہی بچتے ہیں اور یہ مدت حمل ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس استدلال سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر جب نص کا یہ معنی واضح ہوا تو آپ نے اسے تسلیم کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحسین فرمائی اور آپ سے اس سلسلے میں کوئی بحث وجدال نہ کیا اور یہ اجتہاد کی ایک واضح اور کامل مثال ہے۔ اور فہم وادراک کے متفاوت ہونے کا بیّن ثبوت بھی۔

تیسرے سوال کا جواب:

کیا اجتہاد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم ﷺ سے مخالفت جائز تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی ایسی مخالفت اور اللہ تعالیٰ کے قول وما اٰتکم الرّسول فخذوہ (جو رسول اللہ ﷺ تمہیں عطا کریں اسے لے لو) کے درمیان کوئی مخاصمت پائی جاتی ہے بلکہ ایسی مخالفت تو خود رسول اللہ ﷺ کے حکم وارشاد سے عمل میں آتی تھی یہ بات سیرت وحدیث کی کتب سے ثابت ہے کہ آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے فرماتے تھے۔

قولا فانّی لم یوح الیّ فی ھٰذہ مثلکما (۱)

''تم دونوں کچھ کہو کیونکہ اس معاملے میں تمہاری طرح میرے پاس کوئی وحی نہیں آئی''۔ اس بناء پر مذکورہ آیت مبارکہ سے وہ قطعی نصوص مراد ہیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی تھیں یا وہ ایسی نصوص ہوں گی جن میں وحی کے نزول کے بعد اجتہاد کیا گیا ہو مگر نزول وحی سے پہلے تو ان میں اجتہاد مطلوب ومقصود ہے اسی لئے تو نبی اکرم ﷺ

---

(۱) مجلۃ الازہر: ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو اس اجتہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

چوتھے سوال کا جواب:

کس دلیل سے حضرت عمر نے نبی اکرم ﷺ کو رئیس المنافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (۱)

''نبی اور ایمان والوں کو لائق نہیں کہ مشرکوں کی بخشش چاہیں اگر چہ وہ رشتہ دار ہوں جبکہ انہیں کھل چکا کہ وہ دوزخی ہیں'' اس آیت شریفہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب مشرکین کیلئے استغفار منع ہے تو ان پر نماز جنازہ پڑھنا تو بطریق اولیٰ منع ہوگا۔ لیکن سورہ توبہ کی اس آیت سے نبی کریم ﷺ نے یہ سمجھا کہ ان کے لئے استغفار کرنا صرف اس شخص کیلئے جائز نہیں جس کی موت شرک پر واقع ہوئی ہو اور شرک صرف دو طریقوں سے ثابت ہوگا۔ یا تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق آپ کو وحی کر دے جیسا کہ ابولہب کے بارے آپ کو بذریعہ وحی یہ خبر کر دی گئی کہ وہ ایمان نہ لائے گا یا وہ خود اپنے کفر کا برملا اعلان کر دے جیسا کہ مشرکین نے اپنے کفر و شرک کا اعلان و اظہار کر دیا تھا۔ مگر منافقین کا حال اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ ظاہراً تو ایمان کا اعلان کرتے تھے۔ اور باطناً وہ کفر پر قائم تھے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ظاہری حال کے مطابق ہی ان سے معاملہ کیا اور انہیں مومنین فاسقین کی سطح پر رکھتے ہوئے

---

(۱) التوبہ : ۱۱۳

ان کیلئے استغفار فرمایا اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اُن کے لئے اُن کے گناہ معاف کردے اوران کا حال درست کردے اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو کسی ایسے شخص کیلئے استغفار کرنے سے منع نہ کیا ہاں جب اس کے دوزخی ہونے کا قطعی ثبوت ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے استغفار سے آپ کو منع فرمادیا جب کہ نص قطعی **من بعد ماتبیّن ۔۔**
سے بھی یہ بات ثابت ہورہی ہے اور یہ قطعی ثبوت یا تو اس شخص کے علانیہ کفر سے ظاہر ہوسکتا ہے اور یا وحی ربانی سے کہ یہ شخص ایمان نہ لائے گا۔ مگر منافقوں کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اختیار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ** (۱) ''تم ان کیلئے معافی چاہو یا نہ چاہو'' اور جہاں تک عبداللہ بن اُبی کا مسئلہ ہے اس نے تو ایمان ظاہر کیا تھا بلکہ اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آپ کا کرتہ مبارک حاصل کرنے اور آپ سے نماز جنازہ پڑھنے کیلئے بھی بھیجا تھا یہ سب کچھ تو اس کے ظاہری ایمان کی دلیل دکھائی دیتا تھا مگر باطنی طور پر اس کے کفر کا ثبوت تو آپ پر وحی کے ذریعے ہی معلوم ہوا اس پہلو سے تو آپ ﷺ کا یہ اجتہاد ہی ظاہر اور معقول نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کے اس فہم واجتہاد پر کوئی نقص و عیب ظاہر نہ کیا کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حکم ارشاد فرمایا **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ** (۲)

''اور ان میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اسکی قبر پر کھڑے ہونا بے شک

---

(۱) التوبہ : ۸۰ (۲) التوبہ : ۸۴

وہ اللہ اور رسول سے منکر ہوئے اور فسق ہی میں مر گئے۔'' اس قول مبارک کا معنی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ پر وحی کی کہ ان کی موت کفر پر ہوئی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے فسق سے تعبیر فرمایا کیونکہ وہ ظاہراً تو ایمان کا ہی اظہار کرتے تھے۔ اور یہ بھی بدیہی بات ہے کہ جو کفر کی حالت پر مر جائے اسکی تو نماز جنازہ پڑھنی جائز نہیں ہے۔ مگر اسکی کفر پر موت تو وحی پر موقوف ہے۔ اور نزول وحی سے پہلے تو نبی کریم ﷺ کی شان وحالت تو اس قاضی کی طرح ہے جو ظاہری پہلو پر ہی فیصلہ جاری کرتا ہے تو جو لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے وہ مسلم ہے اگرچہ باطن میں اسکے خلاف ہی عقیدہ رکھتا ہو۔

مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ان قطعی قرائن پر مبنی تھا کہ اسکی موت نفاق اور کفر پر ہی ہوئی ہے ان کا اعتقاد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر اس شخص کا حال مخفی نہیں ہے اس لئے اس حالت میں اس پر نماز پڑھنا اس نص مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (۱)

کے خلاف ہے مگر نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر کو یہ جواب دیا کہ یہ آیت کریمہ تو ان مشرکوں کے حق میں اتری ہے جو علانیہ شرک کرتے رہے اور شرک پر ہی ان کی موت واقع ہوئی مگر وہ منافق جنہوں نے ایمان کا اظہار کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق مجھے استغفار کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ ان کے متعلق تو مجھے اختیار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۲)

---

(۱) التوبہ : ۱۱۳ (۲) التوبہ : ۸۰

اور یہ اتنا خوبصورت جواب تھا کہ جسے سن کر حضرت عمر نے سر تسلیم خم کر دیا مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ باقی ماندہ منافقین میں اب ایمان کی کوئی امید نہیں ہے ان کی موت اب کفر پر ہی ہوگی اس لئے اب ان میں کسی کی میت پر نماز نہ پڑھنا اس سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے اجتہاد کو مسترد کر دیا یا ان کے استدلال کو غلط قرار دیا تو اسکی کج فکری اور غلط فہمی ہے بلکہ اس میں تو آپ ﷺ کو مستقبل کا علم دیا جا رہا ہے کہ اب وہ کفر و شرک پر ہی مریں گے تو ان میں سے کسی پر بھی آپ نماز نہ پڑھیں کیونکہ ان کا دوزخی ہونا ظاہر ہو چکا ہے۔ اس بحث سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت عمر کے اجتہاد کا اپنا اپنا رخ تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اجتہاد نبی ﷺ کا وہ رخ ظاہر ہوا تو آپ نے اسے فی الفور تسلیم کر لیا۔

اس گفتگو کا حاصل یہ تین چیزیں ہیں۔

1: جس کی موت کفر پر واقع ہو اور اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہو جائے تو ایسے شخص کیلئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو استغفار کرنے سے منع فرما دیا

2: جو منافق ایمان ظاہر کریں اور کفر کو چھپائیں مگر ان کے افعال و اقوال سے ان کا نفاق ظاہر ہو رہا ہو ان کیلئے نبی اکرم ﷺ کو استغفار کرنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق آپ کو اختیار دے دیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی فرما دیا کہ ان سے جس کی موت کفر پر ہوئی یہ استغفار اسے کوئی نفع نہ دے گا۔

3: ان میں جس کے کفر پر مرنے کے بارے وحی آئے تو اسکے ساتھ کافروں والا معاملہ کیا جائے۔ اور اگر وحی نہ آئے تو اسکے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک اختیار کرتے ہوئے اس پر نماز پڑھ دی جائے۔

پانچویں سوال کا جواب:

بہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کو برقرار رکھا آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب لینے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ رحمت وشفقت کے اعتبار سے نوع انسانی میں سب سے اعلیٰ واکبر منزل پر فائز تھے بلکہ اخلاق کاملہ میں نوع بشر کیلئے اعلیٰ نمونہ تھے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۱)

''اور بے شک تمہاری خوبو بڑی شان کی ہے۔'' وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۲)

''اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے تو تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو۔''

وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (۳)

''اور جو تم میں مسلمان ہیں ان کے واسطے رحمت ہیں۔''

چنانچہ عبداللہ بن اُبی کے قصے اور دیگر واقعات میں آپ کا اجتہاد آپ کی بے پناہ رحمت وشفقت اور اس شدید خواہش پر مبنی ہوتا تھا کہ نوع انسانی کو ہدایت نصیب ہو اور وہ اپنے خالق و مالک کی رضا پا کر ابدی سعادت کے وارث ہو

---

(۱) القلم : ۴ (۲) آل عمران : ۱۵۹ (۳) التوبہ : ۶۱

جائیں۔اس قصے میں بھی ہمیں آپ کی رحمت ورأفت کا یہی تصور ملتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے ہر ممکن طور وطریقے سے آپ کو اذیت دی اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں مشکلات پیدا کیں اور جب بھی کوئی موقعہ آیا اپنے خبث باطنی کا کھل کر اظہار کیا آپ ﷺ نے ہر بار اس سے عفو درگزر فرمایا حتیٰ کہ اس کی وفات کے موقعہ پر بھی (بایں خیال کہ اسکی موت ایمان پر ہوئی ہو) اللہ تعالیٰ سے اسکے لئے معافی چاہی اور اس کے گناہوں کی مغفرت کیلئے دعا کی عبداللہ بن ابی ایسے انسان سے آپ کا ایسا معاملہ کرنا ہم پر واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس میں اللہ کے بندوں کے بارے کتنی اور کیسی محبت ورحمت رکھ دی گئی ہے چنانچہ اس واقعہ کے سلسلے میں یہ مستند روایت بھی ملتی ہے۔کہ جب آپ نے عبداللہ بن ابی کی خواہش پر اسے اپنا کرتہ مبارک عطا کر دیا تو بنی خزرج سے اس کے ایک ہزار پیروکار آپ کے اس حسن سلوک کو دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے اور آپ کی سیاست اور اس اجتہاد سے دین اسلام کو زبردست تقویّت نصیب ہوئی۔

شارح بخاری امام ابن بطّال اور مسئلہ اجتہاد:

فامّا الاجتهاد والاستنباط من كتاب الله وسنّة رسوله واجماع الأمّة فذالک هو الحق الواجب والفرض اللازم لأهل العلم وبنحو هذٰ اجاء ت الاخبار عن النبيّ ﷺ وعن جماعة الصحابة والتابعين روى ابن عمر رضى الله عنه أنّ النبيّ عليه السّلام لما انصرف من الأحزاب قال لايصلّينّ احدا لعصر الّا فى بنى قريظة

فأبطأناس فتخوّفوا فوت الصّلوٰة فصلّوا وقال آخرون لا نصلّی الّا حیث أمرنا رسول اللّٰه ﷺ وان فاتنا العصر فماعنف رسول اللّٰه ﷺ أحد الفریقین (۱)

جہاں تک کتاب اللہ سنت رسول اور اجماع امت سے اجتہاد واستنباط کا تعلق ہے وہ تو واجب اور اہل علم کیلئے فرض لازم ہے اس مسئلہ پر تو نبی اکرم ﷺ صحابہ اور تابعین کی جماعت سے بہت سی اخبار و آثار وارد ہوئی ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب غزوہ احزاب سے لوٹے تو ارشاد فرمایا کہ نماز عصر کوئی بھی نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر کچھ لوگ تاخیر سے چلے اور انہیں راستے میں یہ احساس ہوا کہ بنی قریظہ تک پہنچنے میں تو نماز عصر کا وقت نکل جائے گا اور اس کے فوت ہو جانے کا قوی امکان ہے تو انہوں نے نماز عصر راستے میں ہی پڑھ لی مگر کچھ دوسرے صحابہ نے ان سے کہا کہ اگر چہ نماز عصر فوت ہو جائے ہم تو وہیں نماز پڑھیں گے جہاں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے جب یہ دونوں موقف رسول اللہ ﷺ پر ظاہر ہوئے تو آپ نے کسی فریق کو بھی ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔

قال ابن مسعود رضی اللّٰه عنه من عرض له منکم قضأ فلیقض بما فی کتاب اللّٰه فان جاء أمر لیس فی کتاب اللّٰه فلیقض بما قضیٰ به نبیّه ﷺ فان جاء أمر لیس فی سنّة نبیّه فلیقض بما قضیٰ به الصّالحون فان جاء مالیس فی ذالک فلیجتهد رأیه'(۲)

---

(۱) شرح بخاری : ابن بطال جلد ۱۰ ص ۳۵۲ (۲) شرح بخاری ابن بطال جلد ۱۰ ص ۳۵۴

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس کا جواب کتاب اللہ کے مطابق پیش کرے اگر کتاب اللہ میں نہ پاسکے تو اپنے نبی ﷺ کے فیصلے پر اس کا حل تلاش کرے اور اگر سنت رسول ﷺ میں بھی نہ ملے تو صالحین اہل علم کے فیصلے کی پیروی کرے اور اگر صالحین کے طرز عمل میں بھی نہ مل سکے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔

اللہ رب العزت منافقین کو تہدید اور ڈرانے کیلئے ارشاد فرماتا ہے

أَلَمْ يَعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَىٰهُمْ (۱)

''کیا انہیں خبر نہیں کہ اللہ ان کے دل کی چھپی اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے۔''

بہر حال منافقین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سیاست ہر اعتبار سے بلیغ حکمت پر مبنی تھی مگر جس مقام پر وحی اور رسول نہ ہو وہاں مجتہد کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ کھلے عام منافق کے معاملے میں سخت احتیاط سے کام لے اور اس کے ساتھ شدت اور سختی کا برتاؤ کرے کیونکہ دعوت الی اللہ کے سلسلے میں وہ علانیہ شرک سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے البتہ جب اس کے ساتھ نرمی برتنے سے اس کے یا اسکے متعلقین کے ایمان کی امید کی جاسکتی ہو تو اندریں صورت پوری احتیاط سے اس کے ساتھ نرم رویہ اپنانا مناسب نظر آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کو بظاہر برقرار رکھنے میں یہی راز تھا کیونکہ منافق کے ساتھ معاملے میں اصلاً شدت ہی پیش نظر رہنی چاہئے۔

---

(۱) التوبہ : ۷۸

منافق کیلئے استغفار رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امام شعراوی مصری رحمہ اللہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۱)

''ان پر ایک سا ہے تم ان کی معافی چاہو یا نہ چاہو اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔''

اس قول مبارک میں کسی بھی عدد کی تخصیص نہیں ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ آپ اعداد سے کسی بھی عدد کے ساتھ منافقین کیلئے استغفار کریں اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔ اس ظاہر فرمان الٰہی کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی کیلئے استغفار فرمایا آخر اسکی کیا حکمت تھی ہماری نظر وفکر کے مطابق تو یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ عبداللہ بن اُبی کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ استغفار اسکے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی درخواست پر اسکی دلجوئی کیلئے ظہور پذیر ہوا تھا۔ نیز تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عبداللہ بن ابی نے اپنا حصہ دنیا میں ہی وصول کرلیا تھا۔ ارشاد رب العزت ہے

إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا (۲)

''ہم ان کے اجر ضائع نہیں کرتے جن کے کام اچھے ہوں۔'' عمل کی جزا کسی کو دنیا میں ہی دے دی جاتی ہے اور کسی کو آخرت میں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (۳)

''جو آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کے لئے اسکی کھیتی بڑھائیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہے

---

(۱) المنافقون: ۶ (۲) کہف: ۳۰ (۳) شوریٰ: ۲۰

ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔"

علماء سیرت نے انتہائی وثوق اور صحیح سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پیر کے روز ابولہب کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے جبکہ ابولہب کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱)

"تباہ ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو ہی گیا اسے کچھ کام نہ آیا اس کا مال اور نہ جو کمایا اب دھنستا ہے لپٹ مارتی آگ میں وہ۔"

پیر کے روز اس کے عذاب میں کیوں تخفیف کر دی جاتی ہے اس کی وجہ بس یہی ہے کہ اس روز رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ اور آپ کی ولادت پر وہ خوش ہوا تھا اور آپ کے میلاد کی خوشخبری دینے والی اپنی کنیز کو اس نے آزاد کر دیا تھا اسکے اس عمل کی جزا اسے تخفیف عذاب کی صورت میں دی جاتی ہے اسی طرح عبداللہ بن اُبی نے معاہدہ حدیبیہ کے موقعہ پر جب اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے کسی صحابی کو بھی عمرہ کرنے سے روک دیا اور ایک شرارت کے تحت عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کرنے کی اجازت دے دی تو اس نے اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ انّ لی فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لأرید ان اذہب للعمرۃ الّا اذا ذہب رسول اللہ ﷺ "بے شک میرے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ہی عمدہ اور کامل نمونہ ہے جب تک رسول اللہ ﷺ نہ

---

(۱) لہب : ۱ ، ۲ ، ۳

جائیں میں بھی عمرہ کیلئے نہ جاؤں گا۔"

عبداللہ بن ابی کا یہ موقف قابل تعریف تھا اسی طرح غزوہ بدر کے موقعہ پر بھی اس نے ایک موقف اختیار کیا تھا اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب عمِ رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو گرفتار کیا گیا تو اس اثنا میں ان کے کپڑے پھٹ گئے چونکہ وہ طویل قامت تھے تو عبداللہ بن اُبی کے سوا کسی کی قمیص انہیں پوری نہ آتی تھی چنانچہ اس نے اپنا ایک کرتہ آپ کو پیش کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن اقدس میں اس کا یہ عمل بھی محفوظ تھا چنانچہ آپ نے اس کیلئے استغفار فرمائی جس کے بعد یہ حکم الٰہی صادر ہوا۔

استغفرلهم اولاتستغفرلهم ان تستغفر لهم سبعين مرّة فلن يّغفر الله لهم

اس تقریر کے بعد امام شعراوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ گناہ کی مغفرت اور معافی کیلئے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار ہی کافی نہیں بلکہ اس کیلئے کچھ اور شرائط بھی پوری کرنی ضروری ہیں۔ فمن اذنب عليه ان ياتيک اوّلا يارسول الله يستغفرالله ثم يسألک ان تستغفرله الله حتّى يجدالله توابًا رحيمًا ۔

"جو خدا کا مجرم ہے اس پر لازم ہے کہ اولاً یا رسول اللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے پھر وہ آپ سے عرض کرے کہ آپ اس کیلئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں تو وہ اللہ تعالیٰ کو تواب ورحیم پائے گا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۱)

---

(۱) النساء : ۶۳

''اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہورہا ہے کہ جو توبہ واستغفار کا ارادہ رکھتا ہے رسول اللہ ﷺ اس کیلئے استغفار نہ کریں گے جب تک وہ اوّلاً اللہ تعالیٰ سے استغفار نہ کرے پھر رسول اللہ ﷺ اسکے لئے استغفار کریں تو جب تک وہ خود استغفار نہ کریں گے رسول اللہ ﷺ بھی ان کیلئے استغفار نہ کریں گے اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن اُبی نے استغفار کی کیفیت کو سمجھا ہی نہ تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ صدق دل سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا مگر اس نے تو صرف اپنے بیٹے عبداللہ کو آپ کے پاس بھیج کر اپنے لئے استغفار کا سوال کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسکی عدم مغفرت کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ذَالِکَ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاللّٰہُ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ (۱)

''یہ اس لئے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے منکر ہوئے اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا۔'' (۲)

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

123 اگست 2003ء

---

(۱) التوبہ : ۸۰ (۲) تفسیر الشعراوی سورہ توبہ

باب دوم

صوفیّہ کے حلقہ میں
رائج ذکر کی
شرعی حیثیت

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ صوفیاء کے حلقہ میں جس طرح اسم جلالت ''اللہ'' یا
کسی اور اسم مبارک کا ذکر تکرار کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں بلکہ ذکر
کا معنی مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن ہے اور یہی معنی شرع کا مطلوب و مقصود ہے۔ نیز
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے اونچی آواز کے ساتھ
لا الہ الا اللہ کا ورد و ذکر کرنے والوں کو مسجد سے نکال دیا شریعت اسلامیہ کی روشنی میں
یہ وضاحت فرمادیں کہ یہ کہاں تک درست ہے۔؟

قاری عبدالمجید قادری
خطیب آستانہ عالیہ قادریہ غوثیہ ہڑپہ ضلع ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوفیہ کے سلسلہ میں جس طرح اسم جلالت اللہ یا اسکے کسی اسم مبارک کا ذکر
تکرار کے ساتھ کیا جاتا ہے اسکی کوئی شرعی بنیاد نہیں بلکہ ذکر کا معنی مجلس علم یا مجلس
تلاوت قرآن ہے اور یہی معنی شرع کا مطلوب و مقصود ہے۔

آئندہ سطور میں اس سوال کا قدرے تفصیل سے جواب پیش کیا جارہا ہے۔

ذکر کے کلمہ کو مجلس علم اور مجلس تلاوت قرآن میں محصور کرنا قطعاً درست نہیں بلکہ
اس لفظ کے متعدد معانی کتاب و سنت میں مرقوم ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ تعیین مراد اور
فہم مقصود کے لیے علوم عربیہ سے علم نحو اور علم صرف اور علم بلاغت کا عالم ہونا از حد

ضروری ہے۔ اس مسئلہ پر علامہ ابن حزم أندلسی ۴۵٦ھ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اہم اور خوبصورت بات کہی ہے وہ اپنی معروف کتاب ''ألاحکام فی اصول ا لأ حکام میں فرماتے ہیں

''ولهذا لزم لمن طلب الفقه أن يتعلّم النحو واللّغة والا فهو ناقص منحطّ لا تجوز له الفتيا في دين اللّٰه عزّوجّل''

جوفقہ اسلامی کا طلب گار ہوا سکے لئے لازم ہے کہ وہ علم نحو اور لغہ عربیہ کو سیکھے ورنہ وہ ناقص اور کم درجہ ہوگا اسکے لئے اللہ تعالیٰ کے دین میں فتویٰ دینا جائز نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ کلمہ ذکر کو مجلس علم اور مجلس تلاوت قرآن ان دو معنوں میں محصور کرنا علماء اسلام کے نزدیک محض تحکّم اور تخصیص بلا مخصّص ہے اس کے اطلاق اور عدم تخصیص پر قرآن مجید سے چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں

پہلا معنیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۱)

''اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز کیلئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو''

---

(۱) الجمعہ : ۹

اس مقام پر اللہ کے ذکر کا معنی مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن ہونا ممکن ہے کیونکہ اس لفظ ذکر کے عموم پر اسکے بعد والی آیت مبارکہ تائید کر رہی ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۱)

''پس جب نماز ادا کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''

ذکر کا دوسرا معنی۔۔۔قرآن مجید

ارشاد باری تعالیٰ ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ (۲)

''بے شک کافروں نے ذکر کا انکار کیا جب یہ ان کے پاس آ گیا اور بے شک یہ عزت والی کتاب ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ (۳)

''کیا تم نے تعجب کیا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ذکر آیا تم میں سے ایک مرد پر''

اس آیت مبارکہ میں بھی ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔

---

(۱) الجمعہ : ۱۰ (۲) فصلت : ۴۱ (۳) الاعراف : ۶۹

ذکر کا تیسرا معنی۔۔۔تکبیر کہنا

ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (۱)

''گنے ہوئے دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو'' اس آیت شریفہ میں رمی جمرات کے وقت اور نمازوں کے بعد تکبیرات پڑھنا مراد ہے۔علیٰ ھذا القیاس بہت سی ایسی آیات مبارکہ پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ذکر کا معنی صرف مجلس علمی یا مجلس تلاوت قرآن مجید نہیں بلکہ یہ لفظ کثیر المعانی ہے۔سورہ انفال کی اس آیت مبارکہ سے تو قطعی طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ ذکر کے صرف یہی دو معنی ہی نہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (۲)

''اے ایمان والو ! جب کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو''۔ایسے موقع پر دشمن کے سامنے ذکر کا معنی مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ذکر کا چوتھا معنی۔۔۔ذات رسول ﷺ

اللہ عزّ وجلّ کا ارشاد ہے

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ (۳)

---

(۱) بقرہ : ۲۰۳ (۲) انفال : ۴۵ (۳) الطلاق : ۱۰،۱۱

''بے شک اللہ نے تم پر عزت اتاری ہے وہ رسول کہ تم پر اللہ کی روشن آیات پڑھتا ہے''

قال ابن جرير الصّواب أنّ الرّسول ترجمة عن الذكر يعني تفسير له ولهذاقال الله تعالٰى رسولاً يتلوعليكم آيات الله مبينات (۱)

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ رسول ذکر کا ترجمہ اور اسکی تفسیر ہے اسی لئے اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے رسول تم پر اللہ تعالٰی کی روشن آیتیں تلاوت کرتا ہے۔

مذکورہ آیات کریمہ سے ثابت ہوا کہ ذکر کا لفظ متعدد معانی رکھتا ہے اسے صرف مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن کریم تک محدود کردینا قرآن وسنت کیخلاف جاتا ہے قرآن مجید سے ہی مزید ایک آیت کریمہ پیش کر کے صورتحال کو اظہر من الشّمس کیا جاتا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (۲)

''پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو اللہ کی یاد کرو کھڑے بیٹھے اور کروٹوں پر لیٹے''

اس آیہ مبارکہ میں صلوٰۃ الخوف کا ذکر ہو رہا ہے اگر ذکر سے مراد مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن ہی ہے تو دشمن کی موجودگی میں نماز خوف پڑھنے کے بعد مجلس علم یا مجلس تلاوت قرآن پر عمل اور ذکر کی اس معنی پر تطبیق کیسے ممکن ہوگی۔ پھر لوگوں کے قیام وقعود اور

---

(۱) تفسیر ابن کثیر : ج ۴ ص ۳۸۴ (۲) النساء : ۱۰۳

کروٹوں پر لیٹے ہوئے یہ معنی کیسے صادق آئے گا۔لہٰذا ہر مقام پر ذکر کے یہی دو معنی مراد لینا قطعاً صحیح نہیں۔

ذکر بمعنی تفکّر

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ذکر کا معنی تفکّر یعنی کائنات میں غور و فکر کرنا مقصود ہے جس پر یہ آیت کریمہ شاہد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱)

''جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ بیکار نہ بنایا۔ پاکی ہے تجھے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔''

ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اس آیت کریمہ میں ذکر سے تفکّر و تدبّر مراد لینا درست نہیں۔

اس معنی و مفہوم سے تو ان کی لغت عربیہ سے جہالت اور بے خبری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس آیت کریمہ سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ذکر اور تفکر میں پوری طرح مغائرت پائی جا رہی ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ و یتفکرون کا عطف یذکرون

---

(۱) آل عمران : ۱۹۱

اللہ پر پڑ رہا ہے اسے علماء لغت عربیہ نے عطف بحرف کہا ہے اور یہ قاعدہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عطف مغائرت کا تقاضا کرتا ہے اور واؤ کا ماقبل اسکے مابعد کے مخالف ہوتا ہے حتی کہ اگر ایک ہی کلمہ کا تکرار بھی آجائے مثلاً اقبل رجل و رجل سامنے آیا ایک مرد اور ایک مرد۔ تو پہلا مرد دوسرے مرد کا غیر ہی ہوگا۔

اس قاعدہ سے ثابت ہوا کہ یہاں پر ذکر سے مراد تفکر نہیں ہے کیونکہ ان میں عطف کیوجہ سے مغائرت پائی جاتی ہے۔ بہرحال ذکر کا کلمہ عام ہے اور عام ہونے کی حالت میں یہ مجلس علم اور اس مجلس ذکر کو بھی شامل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ سے کسی بھی اسم مبارک کو بار بار بیٹھتے اٹھتے کروٹ کے بل انفرادی یا اجتماعی طور پر پڑھا جاتا ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ آپ نے مسجد میں ایک ایسی جماعت کو دیکھا جو اونچی آواز کے ساتھ لاالٰہ الا اللہ کا ورد اور ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ میرے خیال میں تم بدعت سے کام لینے والے ہو چنانچہ آپ نے انہیں مسجد سے نکال دیا اس روایت میں یھللون کا صیغہ وارد ہوا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ لاالٰہ الا اللہ کا ذکر کر رہے تھے اور یہ وہی کلمہ ہے جو صحیح بخاری و مسلم میں بھی وارد ہوا ہے۔ یھللونک سیر و سیاحت کرنے والے ملائکہ اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں۔ کہ وہ بندے تیری تھلیل یعنی لاالٰہ الا اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ تو کیا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے انہیں

مسجد سے صرف اس لئے نکال دیا کہ وہ لآالٰہ الاّ اللّٰہ کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اور محض اس وردوذکر پر انہیں بدعتی بھی قرار دے دیا۔ العیاذ باللّٰہ العظیم محض اس روایت کو مستند قرار دیتے ہوئے احادیث صحیحہ جن سے سیاح ملائکہ کی مجلس ذکر میں حاضری کا ثبوت ملتا ہے سے صرف نظر کرنا کونسی علمی دیانت کا مظاہرہ ہورہا ہے امت مسلمہ کے اہل علم کی یہ حرماں نصیبی رہی ہے کہ انہوں نے احادیث موضوعہ میں اتنا اختلاف نہیں کیا جس شدّت سے انہوں نے احادیث صحیحہ کے فہم و معنی میں اختلاف روا رکھا ہے۔ وہ موضوع حدیث کے ترک کرنے میں تقریبا متفق نظر آتے ہیں۔ مگر صحیح حدیث کے معنی و مفہوم میں ایک دوسرے سے متفرّق اور جدا نظر آتے ہیں عدل و انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو مسجد سے صرف اس وجہ سے نکال دیں کہ وہ لآالٰہ الاّ اللّٰہ کا ورد کررہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کرنے والوں کے علاوہ بھی کوئی ایسا شخص ہے جو مسجد میں رہنے کا زیادہ حق دار ہو

البتہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی یہ توجیہ ممکن ہے کہ جب وہ لوگ ذکر بالجہر کررہے تھے تو اسی دوران کچھ لوگ نماز میں مشغول ہوں اور ان کے جہری ذکر سے ان کی نماز میں خلل اور تشویش پیدا ہورہی تھی۔ آپ نے ان سے توقف یا آواز کو کچھ پست کرنے کو کہا ہو مگر وہ نہ مانے۔ تو آپ نے انہیں مسجد سے نکال دیا۔ اس بے سند حکایت کے مقابل صحیح حدیث جو متصل السند ہے جس سے مجلس علم اور مجلس تلاوت قرآن مجید کے علاوہ بھی ذکر کا ثبوت ملتا ہے۔ سے انحراف کرنا دین کی روح سے بے خبری اور کم علمی کا نتیجہ ہے اس موقع پر صحیح احادیث سے دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔

1: عن أبی هريرة رضی الله عنه قال كان رسول الله ﷺ يسير فی طريق مكّة فمرّ علی جبل يقال له جمران فقال سبق المفردون فقالوا وما المفردون يارسول اللّٰه فقال الذّاكرين اللّٰه كثيرا والذكرات(۱)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکّرمہ جاتے ہوئے ایک پہاڑ کے قریب سے گزرے جس کا نام جمران تھا آپ نے ارشادفرمایا مفرد سبقت لے گئے تو آپ کے ساتھیوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مفرد کون ہیں تو آپ نے ارشادفرمایا کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں

2: عن أبی سعيد رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اكثروا من ذكر الله حتی يقولوا مجنون(۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اتنی کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کہ لوگ کہہ اٹھیں یہ تو دیوانے ہیں۔

وصلی اللّٰه تعالیٰ علی سیّدنا محمّد وآله وصحبه وسلّم

عبدالرسول منصورالازہری

18 جولائی 2003ء

---

(۱) مسلم:۲ ص ۲۰۶ (۲) مسند احمد ۶۸/۳: ابن حبان ۹۹/۳ مستدرک حاکم ۷۷/۱

کیا قرآن
سنت رسول ﷺ سے
بے نیاز کرتا ہے؟

کیا قرآن پاک نے سنت رسول ﷺ سے مستغنی کر دیا ہے ؟
بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی کوئی اہمیت نہیں

والسلام

پیرزادہ محمد ظہیر الدین غزنوی نیروی

برمنگھم

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عصر حاضر میں ایک بار پھر یہ آواز زور وشور سے اٹھائی جارہی ہے کہ قرآن مجید نے سنت نبویہ سے مستغنی اور بے نیاز کر دیا ہے اس لئے سنّت کو چھوڑنا اور قرآن پر اکتفاً کرنا ضروری ہے اس مغالطہ کو عام کرنے والے ہمیں تاکیداً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (۱)

ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔ یعنی تمام جملہ علوم اور تمام ما کان و ما یکون کا اس میں بیان ہے اور جمیع اشیاء کا علم اسمیں موجود ہے جب قرآن مجید نے ہر شئے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے اور وہ ہر شئے کیلئے تبیان ہے تو پھر اسکی طرف کسی شئے کے ساتھ اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے یعنی قرآن مجید کی کامل رہنمائی کی موجودگی میں سنّت رسول ﷺ کی قطعاً حاجت نہیں پھر قرآن مجید پورے کا پورا منزل من اللہ

---

(۱) الانعام : ۳۸

ہے اور اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں جبکہ سنت میں صحیح کا موضوع ضعیف اور منکر کے ساتھ بایں طور اختلاط واقع ہوا ہے کہ صحیح کو غیر صحیح سے ممتاز کرنا انتہائی مشکل کام ہے اس لئے خیر اور راحت اسی میں ہے کہ ہم صرف قرآن مجید پر ہی اعتماد کریں اور اسی میں اپنی ہر مشکل کا حل تلاش کریں اس مغالطے کو عام کرنے والوں کا اختصار کے ساتھ یہی موقف ہے۔

ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی الشامی مدظلہ العالی اس مسئلہ پر اپنا موقف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں جس کتاب اللہ پر اکتفاء اور اس پر عمل کرنے کی ہمیں تاکید کی جارہی ہے جب ہم اس میں غور وتامل کرتے ہیں تو اس مغالطے سے تو خود قرآن مجید سے ہی اعراض لازم آتا ہے بلکہ یہ تو قرآن مجید کو غلط قرار دینے پر منتج ہوتا ہے۔ اس مغالطے کے ازالے سے پہلے ہم آپ کے سامنے سنت کا شرعی معنی بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کل ما أثر عن رسول اللہ ﷺ من قول أو فعل أو تقرير علىٰ أن يصل الينا بطريقة صحيحة طبق المنهج المرسوم عند علماء مصطلح الحديث (۱)

رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا گیا آپ کا قول یا فعل یا تقریر جو علماء اصطلاح حدیث کے منہج اور قانون کے مطابق بطریق صحیح ہم تک پہنچا ہو وہ سنت قرار پاتا ہے سنت کی اس تعریف کو پیش نظر رکھنے کے بعد جب ہم اس مغالطے پر توجہ کرتے ہیں کہ قرآن مجید سنت سے بے نیاز کر رہا ہے تو قرآن مجید نے ہمیں یہ کسی مقام پر بھی نہیں کہا کہ تم اپنے دین واسلام کے سمجھنے میں صرف میری کلام پر ہی اکتفاء کرو بلکہ وہ تو بار بار

(۱) یغالطونک اذیقولون ص ۱۵۸ طبعہ دار الفارابی دمشق

ہمیں یہی حکم دیتا ہے کہ میری کلام میں جب بھی تم پر کوئی مغلق اور مشکل بات آئے تو تم اس کے لئے سنت رسول ﷺ کو بیان اور تفسیر بناؤ۔

ہاں اگر قرآن مجید ہم سے یہ کہتا کہ تم نے صرف قرآن مجید سے ہی تمسک اور استدلال کرنا ہے تو اس مغالطے کی صحت کیلئے یہ دلیل کافی تھی جبکہ قرآن مجید ہمیں کتاب اللہ کے ساتھ اتباع سنت کا بھی قطعی حکم دیتا ہے اور کلام اللہ کے ساتھ کلام رسول اللہ ﷺ کو حَکَم اور فیصل ماننے کی بھی تاکید کرتا ہے تو سنت رسول ﷺ سے انحراف اور صرف نظر کرنا صریحاً قرآن مجید سے اعراض قرار پاتا ہے ملاحظہ کریں اس سلسلے میں قرآن مجید کیا ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَامِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱)

اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اسکی اطاعت کی جائے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰه (۲)

جس نے رسول کی اطاعت کی بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۳)

اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴)

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۵)

---

(۱) النساء : ۶۴ (۲) النساء : ۸۰ (۳) الحشر : ۷ (۴) النساء : ۵۹ (۵) النحل : ۴۴

اور ہم نے تمہاری طرف یہ یادگار اتاری کہ تم لوگوں سے بیان کرو جوان پر اترا۔

ان روشن ترین آیات طیبات کے ساتھ یہ آیہ مبارکہ بھی ملاحظہ کریں جس میں تحذیر اور تہدید بھی نظر آرہی ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۱)

''تو اے محبوب تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہونگے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم حکم فرمادو اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں''۔

یہ صریح اور واضح آیات اس بات پر دلیل قاطع ہیں کہ آپ ﷺ کے قول و فعل کی اتباع از حد ضروری ہے نیز نصوص قرآن کی شرح ا ا س کا بیان جو آپ کی طرف سے نقل ہو کر ہم تک پہنچا قرآن مجید کی طرح اس پر عمل پیرا ہونا بھی دین کا بنیادی تقاضہ ہے۔ مفسرین قرآن نے اس آیہ مبارکہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دو مسلمان اپنے کسی معاملے کا فیصلہ کرانے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے مقدمہ کی سماعت کے بعد جب ایک کے حق میں فیصلہ دیا تو دوسرے نے کہا یہ اس لئے ہوا کہ وہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا تھا اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیہ مبارکہ کو نازل کیا نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ آپ نے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ قرآن مجید میں موجود کسی آیت کی تنفیذ نہ تھی بلکہ وہ آپ کا ذاتی فیصلہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ رسول اللہ

---

(۱) النساء ۶۵

ﷺ کے فیصلے کو دل و جان سے قبول نہ کرے گا۔

یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ظاہری حیات میں ہی یہ بتا دیا تھا کہ کچھ لوگ آپ کی سنت پر جرح وطعن کرتے ہوئے اسے نا قابل اعتبار سمجھ کر استدلال کے میدان سے خارج کرنے کی سعی ناتمام کریں گے چنانچہ آپ نے انتباہ اور وعید کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا

عن العرباض بن سارية انّ النبی ﷺ وعظ أصحابه موعظة وجلت منها القلوب وذرفت منها الدّموع فقال له أحد الصّحابة يارسول الله كأنّها موعظة مودّع فأوصنا قال عليكم بالسّمع والطّاعة وان أمّر عليكم عبد عليكم بسنّتى وسنة الخلفاء الراشدين عضّوا عليها بالنّواجذ وايّاكم و محدّثات الأمور فانّ كلّ بدعة ضلالة و كلّ ضلالة فى النار (۱)

''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ سے ایسی وعظ ونصیحت فرمائی جس سے دل ڈر گئے اور آنسو رواں ہوئے ایک صحابی نے آپ سے عرض کیا یارسول اللہ یہ تو الوداع کہنے والے کا وعظ معلوم ہوتا ہے۔آپ ہمیں وصیت فرمائیں آپ نے فرمایا تم سننے اور اطاعت کرنے کو لازم پکڑو اگرچہ تمہارا امیر کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو میری اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو اور اس پر مضبوطی سے عمل پیرا رہو دین میں نئی باتوں سے بچو کیونکہ ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے''۔

(۱) سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ قول بھی موجود ہے۔

یوشک رجل متکئاً علی أریکتہ یحدّث بحدیث عنّی فیقول بیننا و بینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ من حلال حلّلناہ وما وجد نا فیہ من حرام حرّمناہ أ لا وانّ الّذی حرّمہ رسول اللہ مثل الّذی حرمہ اللہ سبحانہ' تعالیٰ (۱)

''ایسا ہوگا کہ کوئی شخص اپنے آراستہ و پیراستہ تخت پر تکیہ لگائے جب میری کسی حدیث کو بیان کرے گا تو کہے گا کہ میرے اور تمہارے درمیان تو کتاب اللہ ہی کافی ہے اس میں موجود حلال وحرام کو ہی حلال وحرام جانتے ہیں آگاہ رہنا رسول اللہ ﷺ کی حرام کردہ چیز اللہ کی حرام کردہ چیز کی طرح ہے۔''

قرآن مجید کے ہوتے ہوئے ترک سنت کی تعلیم دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ سنت میں صحیح کے ساتھ ضعیف منکر اور موضوع احادیث بھی خلط ملط ہو چکی ہیں اور اس موضوع پر التباس واشتباہ بھی کافی حد تک پیدا ہو چکا ہے اس لئے ڈر ہے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے کہ جس سے آپ مبرّا اور منزہ ہیں بایں وجہ کہ امت رسول ﷺ اور آپ کی سنت کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے کہ سنت کو حکم اور فیصل ماننے کی حیثیت سے دور رکھا جائے تاکہ ہم دین کے معاملے میں کھوٹ اور کج فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس فکر اور موقف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سنت رسول ﷺ کے کمال اور انجام کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ پہچانتے ہیں بلکہ وہ اس سلسلے

(۱) ابوداؤد، ترمذی

میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر یہ اتہام رکھتے ہیں کہ وہ سنت نبویہ کے اس انجام کا علم نہ رکھتا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۱)

جس نے اس رسول کی اطاعت کی اس نے حقیقت میں اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ (۲)

اور جو تمہیں رسول عطا کرے اسے لے لو۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۳)

اور ہم نے تمہاری طرف یادگار نازل کی تاکہ تم لوگوں پر بیان کرو جو ان کی طرف اترا۔

قرآن مجید کی یہ آیات بیّنات تو رسول اللہ ﷺ کی تحکیم اور آپ کے قول وعمل کے قطعی ماخذ ہونے کی روشن برھان نظر آرہی ہیں

پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قرآن حکیم کے بعد سنت نبویہ ہی وہ اول کتاب اول موضوع اور شریعت اسلامیہ کا اول مصدر ہے جو زیف اور کھوٹ سے پاک ہے۔

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ اس میدان میں موضوع مکذوب ضعیف اور منکر احادیث بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں مگر ارباب علم وبصیرت پر یہ بات بھی اچھی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی سنت کی حمایت وحفاظت کیلئے ایک ایسا علم بھی مقرر وظاہر فرمادیا جو علوم کی دنیا میں درجہء اعجاز کو پہنچا ہوا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپ کی صحیح حدیث میں موضوع منکر اور زیف کے دخیل ہونیکی قطعاً گنجائش نہیں

(۱) النساء : ۸۰ (۲) الحشر : ۷ (۳) النحل ۴۴

اس مغالطے کو عام کرنے والوں نے علم مصطلح الحدیث اور علم جرح وتعدیل کا نام نہیں سنا کیاان کے علم وعقل میں یہ بات نہیں کہ وہ کیا اسباب تھے جن کے پیدا ہونے پر یہ علوم معرض وجود میں آئے۔ قرنِ اوّل اور قرنِ ثانی کے اوائل میں حدیث رسول ﷺ کی حمایت کیلئے ہی یہ دو علوم ایجاد ہوئے تھے۔ جن میں مندرج قواعد وضوابط کے تحت حدیث کی اقسام مقرر کر کے ان میں صحیح کو موضوع اور مکذوب سے علیحدہ کر دیا گیا اس دور میں یہ شبہ پیدا کرنا کہ صحیح حدیث کا موضوع سے اختلاط ہو چکا ہے اس لئے حدیث کا دین کی بنیاد بننا نا قابل اعتبار ہے کسی صورت بھی قرین عقل دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ قرنِ اوّل اور قرنِ ثانی کا دور تھا جب وضاعین اور دسیسہ کاری کرنے والوں نے احادیث باطلہ کو کلام رسول ﷺ میں مخلوط کر دیا تھا اسی دور میں علماء حدیث نے اس فتنے کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا اور احادیث صحیحہ کو احادیث باطلہ اور موضوعہ سے ممتاز کر دیا۔

بہر حال جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول یا اسوہ رسول کو نہ لیں گے وہ دراصل رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتے ہیں اور وہ اس واسطے کو کاٹتے ہیں جسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطے کے طور پر مقرر فرمایا ہے وہ گویا یہ کہتے ہیں کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لئے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ معاذ اللہ کتاب کو رسول کے ذریعے سے نازل فرمایا کتنی موٹی سی بات ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول ﷺ کا قول دینی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تو پھر رسول اللہ ﷺ کا قرآن کے بارے یہ کہنا بھی قاعدے سے حجت نہ

ہونا چاہئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے پس جب قرآن کے علاوہ نبی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو پھر رسول اللہ ﷺ کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے حجت کا دروازہ جب ایک قول کیلئے کھلتا ہے تو سب کیلئے کھلے گا اور بند ہوگا تو ہر قول کے لئے بند ہو جائے گا اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ حدیث و سنت کے بغیر تو دراصل قرآن سے بھی اکتساب ہدایت ممکن نہیں ہے احادیث و آثار کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔(۱)

حدیث عصری اور جدید تہذیبی تقاضے کے خلاف ہے

دور حاضر کے کچھ مفکرین سنت پر عدم اعتماد کی ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ کچھ احادیث ایسی بھی پائی جاتی ہیں کہ جو زمانے کے عرف اور جدید تہذیب کے تقاضوں سے اتفاق نہیں کرتیں اس سلسلے میں وہ اس حدیث سے مثال پیش کرتے ہیں۔

قال قال رسول الله ﷺ اذا وقع الذباب فی شراب أحدکم فلیغمس ثم لیلقه فان فی أحد جناحیه داءً وفی الآخر شفاء وانه لیتقی بجناحه الذی فیه داء (۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو وہ اسے ڈبو کر باہر پھینک دے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفاء ہے وہ بیماری والے پر سے ہی اپنا بچاؤ کرتی ہے۔

---

(۱) اسلامی نظریہ حیات، مکانۃ السنہ مصطفیٰ سباعی مرحوم (۲) صحیح بخاری، ابن ماجہ

نام نہاد مفکرین کا خیال ہے کہ یہ حدیث جس میں حکم دیا گیا ہے کہ مشروب میں مکھی گر جانے سے اسے پوری طرح ڈبو کر باہر نکال دیا جائے جدید تہذیب کے ساتھ منطبق نہیں ہوتی جبکہ یہ عمل نفس انسانی میں نفرت پیدا کرنے کا باعث بھی ہے۔

حدیث ذباب میں ایسا کوئی معنی نہیں جسے بنیاد بنا کر سنت رسول ﷺ کی حیثیت میں شک وشبہ پیدا کیا جائے آیئے ہم پہلے اس حدیث کے معنی ومفہوم پر غور کرتے ہیں

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کسی کے مشروب میں از خود مکھی گر جائے تو وہ اسے مشروب میں مکمل طور پر ڈبوئے بغیر باہر نہ پھینکے اس کے بعد وہ اس مشروب کو تلف کرنے یا باقی رکھنے میں آزاد ومختار ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اسکے ایک پر میں بیماری اور دوسرے پر میں شفاء رکھی گئی ہے۔ اور وہ بیماری والے پر سے اپنا بچاؤ کرتی ہے تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بیماری کو شفا اور دواء کے ساتھ لاحق کر دیا جائے تا کہ کسی پینے والے کو اس بیماری کے سبب اُذیت وتکلیف نہ پہنچے۔

حدیث مبارک کے اس واضح اور معقول معنی کے بعد کیا ہم نبی کریم ﷺ پر یہ الزام رکھ سکتے ہیں کہ معاذ اللہ آپ جاہل اور مخطئی تھے اگر یہ بات صحیح ہو تو جب آپ ہمیں بذریعہ وحی غیبی امور کی خبر دیتے ہیں تو اس وقت بھی آپ پر جہل وخطاء کا الزام عائد ہونا چاہئے العیاذ باللہ من ذالک

آپ ﷺ کی وہ حدیث جس میں آپ نے بذریعہ وحی موت کے بعد امور ووقائع کی خبر دی ہے وہ حدیث ذباب سے زیادہ عجیب وغریب نہیں ہے جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کلام میں حدیث ذباب کے اندر شک کرتا ہے وہ یقیناً آپ کے اس کلام میں بھی

شک کرے گا کہ عذاب قبر اور نکیرین کا سوال کرنا حق ہے اور قیامت کے روز لوگ اللہ رب العالمین کے حضور کھڑے کئے جائیں گے کیونکہ یہ امور بھی تو جدید تہذیب وتمدن کے تقاضوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔

بہر حال ہمارے لئے اس کلام کے قبول اور اس پر یقین کیلئے یہی کافی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے جو ہم تک صحیح اور متصل سند کیساتھ پہنچا ہے جس میں کوئی شذوذ اور علت نہیں پائی جاتی چنانچہ دور حاضر میں **1987**ء میں چین کے سائنسدانوں کی ریسرچ کے مطابق یہ بات ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ مکھی کے جسم میں دونوں قسم کے جراثیم موجود ہیں جو بیماری کا سبب بنتے ہیں اور جو اس بیماری کو ختم بھی کردیتے ہیں۔(۱)

عبد الرسول منصور الازہری

2 ربیع الثانی **1425**ھ

---

(۱) ذیلی شنگھائی 1987ء، یغالطونک اذ یقولون ڈاکٹر رمضان بوطی شامی ص ۱۶۷

قرآن مجید
اور
عثمانی رسم الخط

قرآن مجید کا عثمانی رسم الخط کیا حضرت عثمان کی اختراع وایجاد تھی؟

امت مسلمہ کا رسم عثمانی پر تمسک اور اس پر اجماع کرنا قدامت پرستی اور جمود وتقلید تو نہیں ہے۔ کئی مقامات پر قرآن مجید کے بعض کلمات میں رسم الخط کا اختلاف ہے اس کی کیا حکمت ہے۔

کیا قرآن پاک کی کتابت وطباعت میں رسم عثمانی کا التزام ضروری ہے؟

سید فدا حسین شاہ

خطیب جامع مسجد چلہ گاہ

شیر شاہ ولی راجپورہ ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید نے کچھ ایسے مخصوص کلمات استعمال کئے ہیں جن کی شکل ورسم املائی رسم الخط کے بالکل مغائر اور اس سے مختلف نظر آتی ہے۔ کیا یہ انداز عجیب وغریب اور ندرت کا حامل نہیں، رسول اللہ ﷺ کا یہ قول کہ

اقرأو القرآن فان لکم بکل حرف عشر حسنات لا اقول الم حرف ولکن الف حرف ولام حرف ومیم حرف۔۔۔۔

''قرآن مجید پڑھو اس کے ہر حرف کے بدلے تمہیں دس نیکیاں ملیں گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک

حرف ہے"

حروف قرآن کی اہمیت

ان پر خصوصی توجہ اوران کی شان کے مطابق ادائیگی پر گہری بصیرت اور نظر عمیق رکھنے کی دلیل دکھائی دیتا ہے کیوں کہ حسنات وخیرات کے سلسلے میں ہر حرف کی میزان اور ترازو رکھ دی گئی ہے کہ جب کوئی مسلمان اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پڑھے گا تو اس کے ساتھ اسے اجر وانعام سے نوازا جائے گا۔ اسی لئے اہل تحقیق اور راسخ فی العلم حضرات کا قول ہے کہ اعجاز قرآن صرف قرآن کی نظم اوراس کے جملوں سے ہی متعلق نہیں بلکہ اس کے کلمات مفردہ بھی اس حسن وکمال سے مالا مال ہیں نیز اس سے ان حضرات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو قرآن مجید کو بھی خط املائی کی طرح کتابت کرنے کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ امت مسلمہ کا رسم عثمانی پر تمسک اوراس پر اجماع کرنا قدامت پرستی اور جمود وتقلید کی بات نہیں جیسا کہ دور حاضر کے نئے دانشور اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ پوری نص قرآن کی طرح رسم مصحف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسم توقیفی ہے۔ جسے آخری اور حتمی صورت میں جمع قرآن اوراسے بلاد اسلامیہ میں تقسیم وترسیل کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو خود بھی عربی النسل تھے ان کا جمع قرآن پر ایسا رسم الخط اختیار کرنا جو ان کی عادت مألوفہ اور آپ کے مکتوبات اور رسائل کے رسم الخط کے بھی خلاف تھی۔ آخر اس طرز عمل کو اپنانے کی کوئی وجہ تو ہوگی اور اگر یہ آپ کی

اختراع اورنئی ایجاد تھی تو کم از کم کوئی ایک ضعیف روایت تو وارد ہوتی کہ اس وقت کے کسی ایک کاتب قرآن نے اس رسم الخط کو دیکھ کر آپ سے معارضہ یا مناقشہ کیا ہوتا یا آپ سے یہ سوال کیا ہوتا کہ آخر آپ نے عامۃ الناس کی عادت سے ہٹ کر کتابت کا یہ انداز کس لئے اختیار کیا۔ تو یہ اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ قرآن مجید کا یہ رسم الخط بھی توقیفی اور امر الٰہی کے مطابق برقرار رکھا گیا ہے اس لئے اس کے اندر تغیر و تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں اور تلاوت و کتابت قرآن کے وقت اس کو پیش نظر رکھنے پر بھی مسلمان کو اجر وانعام سے ہم کنار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ سنت اور طریقہ ہے جو رسول اللہ ﷺ سے چلا آرہا ہے اس لئے اس معنی و حقیقت کا لحاظ رکھنا بھی از حد ضروری ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بعض کلمات میں اس رسم الخط کے اختلاف کا راز اور اس کی حکمت کیا ہے۔ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف بھی اعجاز نما ہے۔ ورنہ قرآن مجید میں ایک مخصوص کلمہ کا پایا جانا جس میں خط املائی کی مخالفت دکھائی دے رہی ہو چہ معنی دارد؟ اور اگر اس اختلاف کا کوئی معنی تلاش کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو سوائے شک اور تخمین وظن کے اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ہم قرآن مجید میں وارد ہونے والے کلمہ ''الـلیـل'' پر توجہ دیں تو اسے پورے قرآن مجید میں صرف ایک لام کے ساتھ یعنی ''الیـل'' لکھا ہوا پاتے ہیں۔ آخر اس میں کیا راز ہے۔ اور ایسا کیوں لکھا گیا اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ہی کلمہ کو ایک بار ایک رسم الخط اور دوسری بار اسی کلمہ کو دوسرے رسم الخط میں لکھا ہوا پاتے ہیں اور اس سے بھی شدید تعجب اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک کلمہ

قرآن مجید میں کئی بار تکرار کے ساتھ آتا ہے مگر اسے کسی ایک مقام پر مختلف رسم الخط دے دیا گیا ہے کیا ایسا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا اور کیوں کیا۔؟

قرآنی رسم الخط کے اختلاف کی چند مثالیں

''الکتاب'' کا کلمہ پورے قرآن مجید میں ۲۵۵ مرتبہ وارد ہوا ہے مگر مندرجہ ذیل چار مقامات کے علاوہ اسے بغیر الف ''الکتٰب'' ہی لکھا گیا ہے۔ وہ چار مقامات ہیں جن میں اسے ''الکتاب'' الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (۱)

وَمَآ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۲)

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ (۳)

طٰسٓ o تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۴)

''ساحر'' یہ کلمہ قرآن مجید میں ''ساحر'' کی صورت میں وارد ہوا ہے اور پھر ایک دوسری آیت میں ''سٰحر'' کی رسم میں پایا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

کَذٰلِکَ مَآ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵)

فَتَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۶)

---

(۱) سورہ الرعد ۳۸ (۲) سورہ الحجر: ۴ (۳) سورہ الکہف: ۲۷ (۴) سورہ النمل: ۱

(۵) سورہ الذاریات: ۵۲ (۶) الذاریات: ۳۹

اس مقام پر تعجب کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ جب یہی کلمہ ایک ہی آیت میں دو دفعہ وارد ہو کر ''الف'' کے ساتھ اور ''الف'' کے بغیر رقم دکھائی دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاَلْقِ مَافِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَاصَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ ط
وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (۱)

''نشاء'' یہ کلمہ رسم املائی کے ساتھ قرآن مجید میں ۱۸ مرتبہ وارد ہوا ہے مگر ایک مقام پر مختلف رسم الخط میں دکھائی دے رہا ہے اور وہ رسم یوں ہے ''نشٰؤا'' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَایَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۲)

''وراء'' یہ کلمہ رسم املائی کے ساتھ یوں وارد ہوا ہے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًافَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۳)

اور دوسری آیت میں مختلف رسم کے ساتھ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ (۴)

''ابرھم'' یہ کلمہ سورہ بقرہ میں ۱۵ مرتبہ ''ابرھم'' کی رسم میں وارد ہوا ہے اور باقی پورے قرآن میں ''ابرھیم'' کی شکل میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

کتاب مبین میں ہر مقام پر ''شیء'' کا کلمہ ''شیء'' کی صورت میں لکھا گیا ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵)

---

(۱) طٰہٰ: ۶۹ (۲) سورہ ہود: ۸۷ (۳) سورہ احزاب: ۵۳ (۴) سورہ الشوریٰ: ۵۱ (۵) البقرہ: ۲۰

مگر سورہ الکھف میں یہی کلمہ "شای ء" کی شکل میں مرقوم نظر آتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا (۱)

عثمانی رسم الخط اور امام شعراوی مصری رحمہ اللہ

دور حاضر کے عظیم مفسر قرآن علامہ شعراوی مصری رحمہ اللہ قرآن مجید کی مخصوص اور منفرد کتابت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن مجید عام اور مروّج کتابوں سے الگ تھلگ ایک ایسی کتاب ہے جس کی قرأت اور کتابت بھی خاص طرز اور انداز کی حامل ہے۔ مثلاً جب ہم آیات ربا پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک آیت کے سوا باقی پورے قرآن میں "ربوٰ" واؤ کے ساتھ لکھا ہوا پاتے ہیں اور وہ آیت جس میں "رِبًا" الف کے ساتھ مرقوم ہے۔

سورہ روم کی آیت نمبر ۳۹ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝

اگر کتاب اللہ کا معاملہ بھی عام کتابوں جیسا ہوتا تو اس کے متشابہ اور باہم تناسب رکھنے والے کلمات کو ایک ہی انداز سے لکھا جاتا جب ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۲) کی قرأت کرتے ہیں تو ایک مقام پر باء کے بعد الف محذوف اور غیر موجود پاتے ہیں

---

(۱) الکھف : ۲۳ (۲) سورہ علق : ۱

اور دوسرے مقام پر بأ کے بعد الف موجود اور مکتوب دیکھتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر کلمہ اور ہر نزول جو وحی الٰہی سے تعلق رکھتا ہے وہ ایک مخصوص شکل اور اسلوب کا حامل ہے۔ جس کا التزام اور اہتمام خود رسول اللہ ﷺ نے فرما کر اسے اپنی امت تک پہنچایا اور آپ ﷺ کے بعد جمع قرآن کے سلسلے میں بھی اس التزام واہتمام کو برقرار رکھا گیا اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی خواہش سے نہ کچھ کہا اور نہ ہی آپ اس وحی ربانی میں کسی ادنیٰ سی تبدیلی کا کوئی اختیار رکھتے تھے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۱)

اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔(۲)

بہر کیف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو محکم اور اس کے کلمات کو مفصل طور پر بیان کر دیا گیا تا کہ اہل ایمان تک اللہ کا دین اصلی شکل وصورت میں ان تک پہنچا دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۳)

یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم اور استوار کی گئیں پھر ان کی تفصیل کی گئی۔ حکمت والے خبردار کی طرف سے۔

گویا اس کا ہر ہر حرف ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے کلمات کا ہر معنی ایک

---

(۱) سورہ النجم : ۳،۴ (۲) ترجمہ کنز الایمان از امام احمد رضا رحمہ اللہ (۳) سورہ ہود :۱

خاص مذاق کا حامل دکھائی دیتا ہے باالفاظ دیگر یہ وہ کتاب مبین ہے کہ اس میں اترا ہوا ہر حرف ایک خاص شکل وصورت لئے ہوئے اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ وہ وحی ربانی ہے جسے قرآن مجید کی صورت میں رسول اللہ ﷺ تک پہنچا گیا اسکی قدمیت و مرتبت اسلوب قرأت منہج ہدایت اور اس کا طریقہ کتابت سب کچھ اللہ جل مجدہ کی طرف سے ہے۔

قرآنی اسلوب قرأت کی ایک واضع مثال

سورہ بقرہ کی ابتدء الٓمّ کے کلمہ سے ہورہی ہے اور یہی کلمہ سورہ انشراح کی ابتداء میں بھی موجود ہے یعنی **الم نشرح لک صدرک** ہردو مقام پر اس کلمہ میں تین حروف موجود ہیں ،الف لام میم مگر سورہ بقرہ میں اسے الف لام میم پڑھا جاتا ہے اور سورہ انشراح میں الم اس فرق کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کلمہ کی اسی طرح قرأت کی تھی پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی اسے اسی فرق اور انداز کے ساتھ تلاوت فرمایا تھا کیوں کہ اس مقام پر حروف کی شکل کو کوئی دخل نہیں بلکہ قرآن مجید کی قرأت اور اس کی کتابت میں مخصوص طریقہ کار کو ملحوظ رکھا گیا جو دنیا کی کسی بھی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔(۱)

عبدالفتاح سید جمعان اور خط مصحف

ممتاز مصری مفکر اور معروف عالم دین علامہ عبدالفتاح سید جمعان قرآنی

---

(۱) الطریق الی القرآن شیخ متولی شعراوی رحمہ اللہ / تاملات فی اعجاز الرسم القرآنی محمد شملول مصری

رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مصحف شریف کا خط ہمارے اس خط املائی کے مخالف ہے جسے ہم اپنی عام کتابت و مطابع میں استعمال و رائج رکھتے ہیں اور رسم مصحف سے وہ خط مراد لیا جاتا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے وجود میں آیا اور آج تک بدستور چلا آرہا ہے۔ یہ وہ خط ہے جو بعض قواعد املائیہ سے مختلف اور متمیز نظر آتا ہے۔ خط مصحف کا خط املائی سے اختلاف کا ایک مظہر یہ ہے کہ کلمے کے آخر پر واقع ہونے والی واؤ کے بعد الف زائد دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ملاقوا یعفوا یا ایسی واؤ پر کھڑی زبر لکھی نظر آتی ہے جیسے الصلوۃ الذکوۃ ۔۔ اہل علم کی جانب سے خط مصحف پر یہ التزام واجماع اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ حفاظت قرآن کے سلسلے میں ایک یہ بھی اہتمام کردیا گیا کہ اس کتاب مبین کا خط بھی عام کتابوں کی کتابت سے منفرد اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نطق وقرأت کے ساتھ رسم الخط اور شکل میں بھی محفوظ اور ممتاز نظر آئے۔ مصحف شریف کی کتابت اور طباعت میں اس رسم عثمانی کا التزام و اعتبار رکھنا جمہور علماء کی رائے ہے۔(۱)

امام جلال الدین سیوطی اور رسم عثمانی

عظیم محدث اور مفسر قرآن علامہ جلال الدین سیوطی مصری رحمہ اللہ خط عثمانی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت امام امالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا مصحف کو عام رائج کتابت کے مطابق رقم کرنا جائز ہے تو آپ نے فرمایا نہیں اس کی کتابت کا وہی انداز اور التزام ہونا چاہئے جو دور عثمانی سے چلا آرہا ہے۔ ایک

دوسرے موقع پر آپ سے سوال ہوا کہ وہ حروف جو عام خط سے ہٹ کر رسم مصحف میں زائد لکھے جاتے ہیں مثلاً اولوا اس میں پہلی واؤ اور آخری الف یہ کتابت میں تو موجود ہیں مگر پڑھنے میں نہیں آتے کیا مصحف میں اس رسم کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ تو آپ نے کہا ہرگز نہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے کہ مصحف عثمانی والے خط میں واؤ یا اور الف کی مخالفت اختیار کرنا حرام ہے۔ یہی بات امام بیہقی نے شعب الایمان کے اندر بھی کہی ہے کہ مصحف شریف لکھنے والے پر لازم ہے کہ وہ اس کے خط میں اسی ھجا اور طرز نگارش کا لحاظ رکھے جو دور عثمان رضی اللہ عنہ سے چلی آرہی ہے اس کی مخالفت اور اس رسم میں تغیّر و تبدّل کرنا کسی صورت بھی جائز نہیں کیونکہ صدیوں سے جن کاتبین قرآن نے اس خط قرآن کو اپنا رکھا ہے وہ ہم سے علم وتقویٰ، صدق قلبی، عفت لسانی اور اداء امانت میں انتہائی اونچے درجوں پر فائز تھے۔ (۲)

شیخ الازھر جاد الحق علی جاد الحق رحمہ اللہ کا رسم عثمانی پر تبصرہ

عظیم مصری مفکر اور فقیہ عصر شیخ جاد الحق قدس سرہ العزیز اس مسئلہ پر اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

من علوم القرآن الرسم العثمانی اتّفقت کلمة فقهاء المذاهب المشهورة علی ضرورة الالتزام فی کتابة المصحف بالرّسم العثمانی

---

(۱) مجلہ الازہر شعبان ۱۴۲۳ھ (۲) الاتقان فی علوم القرآن جلد۲ ص ۲۷۳

باعتبار ان هذا الرسم هوما كتب به القرآن فى حياة رسول الله ﷺ واقرهم عليه ثم جاء ابو بكر رضى الله عنه فكتب القرآن بهذا الرسم وتبعه عثمان رضى الله عنه فى كتابة المصاحف بموافقة الصحابة دون نكير من احد فيكون اجماعا ومن ثمّ يلزم المصير الى طباعة المصحف بهذا الرسم لاغير... (۱)

قرآن مجید کا عثمانی رسم الخط بھی علوم القرآن سے تعلق رکھتا ہے۔ مذاہب مشہورہ کے تمام فقہاء نے مصحف شریف کی کتابت میں رسم عثمانی کے التزام کی ضرورت پر اتفاق کیا ہے۔ کہ یہ وہی رسم خط ہے جس پر حیات رسول اللہ ﷺ میں قرآن مجید کو لکھا گیا تھا اور آپ نے انہیں اس پر برقرار رکھا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی رسم الخط پر قرآن مجید لکھوایا اور آپ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی مصاحف شریفہ کی کتابت میں اسی رسم الخط کو اپنایا اور کسی صحابیء رسول ﷺ نے بھی اس پر کوئی انکار و اعتراض نہ کیا تو گویا اس رسم الخط کی صحت و ضرورت پر صحابہ کا اجماع ہو گیا اس لئے مصحف کی طباعت پر اس رسم الخط کا اہتمام و التزام ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن مجید کو لکھنا منع ہے۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه وعلى آله وصحبه اجمعين

عبدالرسول منصور الازہری

10 جون 2003ء

---

(۱) مع القرآن شیخ جادالحق ص ۱۷۲ مطابع الاخبار مصر

گیارہویں شریف
اور
اسکی حقیقت

گیارہویں شریف کی حقیقت بیان فرمائیں بعض لوگ اسے حرام اور بدعت سیئہ کہتے ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

حافظ محمد صفدر

جہاز گراؤنڈ ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہل سنت و جماعت سواد اعظم کے نزدیک مسئلہ ''ااویں'' کی حقیقت و اصلیت عبادت بدنی اور عبادت مالی کا اموات کی ارواح کو ایصال ثواب ہے۔ ایصال ثواب خلاف شریعت ہے اور نہ ہی حرام و بدعت ایصال ثواب کا انکار صرف معتزلہ نے کیا ہے کیونکہ وہ حیات اموات کے قائل نہیں ہیں ذیل میں چند شرعی دلائل سے اس کا ثبوت پیش کیا جا رہا ہے۔

حدیث کی معروف کتاب مشکوۃ ص ۱۶۹ پر موجود ہے عن سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ یارسول اللہ ﷺ ان أمّ سعد ماتت فایّ الصدقة افضل قال الماء فحفر بئرًا وقال هذه لأم سعد ۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ سعد کی ماں کا انتقال ہو گیا پس کونسا صدقہ بہتر ہو گا نبی کریم ﷺ نے فرمایا

پانی تو حضرت سعد نے کنواں کھودا اور فرمایا یہ سعد کی ماں کا کنواں ہے۔

سنن ابوداؤد کے حوالے سے یہ حدیث بھی مشکوٰۃ شریف میں موجود ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میرے والد عاص بن وائل نے مرتے وقت کہا تھا کہ میں اسکی طرف سے پچاس غلام آزاد کروں تو کیا اس عمل سے اسے فائدہ ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا

انه لو کان مسلمًا فاعتقتم عنه او تصدّقتم عنه او حججتم عنه بلغه ذالک

اگر وہ مسلمان ہوتا اور پھر تم اس کی طرف سے غلام آزاد کرتے یا صدقہ دیتے یا حج کرتے تو ان کا ثواب اسے پہنچتا مشکوٰۃ شریف ص ۱۲۸ پر یہ حدیث بھی مرقوم ہے

عن حنش قال رأیت علیا یضحی بکبشین فقلت له ماهذا فقال ان رسول الله ﷺ اوصانی ان اضحی عنه فأنا اضحی عنه

حضرت حنش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھوں کی قربانی کرتے ہوئے دیکھا میں نے پوچھا اس کا کیا سبب ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ میں آپ کی طرف سے قربانی کیا کروں پس میں آپ کی طرف سے بھی قربانی کرتا ہوں۔

امام جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں کہ عظیم محدث امام طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

قال رسول اللّٰه ﷺ ان اللّٰه تعالٰی یرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنةفیقول یا رب انّٰی لی هذه فیقول باستغفار ولدک

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ عبد صالح کا درجہ جنت میں بلند فرماتا ہے تو وہ بندہ کہتا ہے کہ اے رب یہ مرتبہ کہاں سے ظاہر ہوا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیری اولاد کی دعا کی وجہ سے۔

ایصال ثواب اور اسکی تعیین کی حقیقت

ایصال ثواب کے قطعی ثبوت کے بعد اب اختلاف اس بات میں رہ گیا کہ کیا عرس وغیرہ کی معیّن تاریخوں میں بھی ایصال ثواب جائز ہے یا نہیں ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ بلاشبہ جائز ہے کیونکہ شرعی دلائل سے ایصال ثواب کے حکم کلی کا جواز ثابت ہے اور جو بعض فقہاء نے بیان کیا ہے کہ تعیین بدعت ہے تو گزارش ہے کہ مطلق تعیین بدعت نہیں ہے بلکہ تعیین شرعی بدعت ہے یعنی کوئی شخص یوں اعتقاد کرے کہ اگر گیارہ تاریخ کو ایصال ثواب کیا گیا تو صحیح ہے اور اگر بارہ تاریخ کو کیا گیا تو حرام ہے اور ان تاریخوں میں ایصال ثواب کو فرض یا واجب سمجھے تو یقیناً تعیین بدعت سیئہ ہے اہل سنت ان عرفی تاریخوں کو فرض یا واجب اور ان کے علاوہ دوسری تاریخوں کو حرام نہیں سمجھتے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے ایام میں بھی ایصال ثواب کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ مکی اور تاریخ کی تعیین

رہی تعیین تاریخ یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے کہ جو کام کسی خاص وقت میں معمول ہو یعنی کسی معیّن وقت اس کام کو کرنا معمول بن چکا ہو اس وقت وہ یاد آجاتا ہے اور ضرور آتا رہتا ہے اور نہیں تو سالہا سال گزر جاتے ہیں کبھی خیال بھی نہیں

آتا اسی قسم کی مصلحتیں ہر کام میں ہیں۔(۱)

اب گیارہویں شریف جس کا دوسرا نام ایصال ثواب ہے اسے حرام اور بدعت سیئہ کہنا کسی طور پر بھی صحیح نہیں محض اس بات پر اس مستحب اور مستحسن امر کو بدعت قرار دینا کہ یہ کام دور نبوی میں نہیں ہوتا تھا اس لئے بدعت ہے۔

تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں کسی نماز کی نیت زبان سے ادا نہیں کی مگر علماء نے لکھا ہے کہ قلبی نیت کو زبان سے ادا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں بلکہ مستحب ہے معلوم ہوا ہر وہ نیا کام جسے علماء مستحب جانیں وہ بدعت وحرام قرار نہیں پاتا۔

لباس اور اسلام کی ہدایت

اسلام کی نظر میں لباس سے مقصود دو چیزیں ہیں ایک ستر عورت اور دوسرے زینت چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کیلئے لباس اور زینت کا جو سامان پیدا کیا ہے اسے احسان سے تعبیر کیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (۲)

اے اولاد آدم ہم نے تم پر لباس نازل کیا جو تمہاری ستر پوشی بھی کرتا ہے اور زینت بھی

خالص ریشم کا لباس مرد کو پہننا حرام ہے ارشاد رسول ﷺ ہے

لاتلبسو الحریر فانّ من لبسه فی الدنیا لم یلبسه فی الأخرة (۳)

ریشم کو نہ پہنو کیونکہ جو شخص دنیا میں ریشم پہنتا ہے وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا

---

(۱) فیصلہ ہفت مسئلہ ص ۹ (۲) اعراف ۲۶ (۳) بخاری ومسلم

مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس پہننا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

لعن اللّٰه الرّجل یلبس لبسة المرأة والمرأة تلبس لبسة الرّجل (۱)

اللہ تعالیٰ نے عورت کا لباس پہننے والے مرد پر لعنت کی ہے اور مرد کا لباس پہننے والی عورت پر بھی لعنت کی ہے۔

شہرت اور تکبر کا لباس

نبی کریم ﷺ نے شہرت کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے جن سے فخر ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی خواہش اور مقابلہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں حدیث مبارکہ ہے

من لبس ثوب شهرة ألبسه اللّٰه ثوب مذلّة یوم القیامة (۲)

جو شخص شہرت کا لباس پہنے گا اللہ اسے قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا بہرحال اسلام کی اس ہدایت کے مطابق ہر وہ لباس جو ستر پوشی اور جمال و زینت میں شمار ہوتا ہے۔ وہ مقامی موسم اور طرز و وضع کے مطابق پہننا جائز اور صحیح قرار پاتا ہے پینٹ اور شرٹ اب صرف مغرب میں رہائش پذیر لوگوں کا لباس ہی نہیں رہا بلکہ اسلامی ممالک کی افواج اور دیگر بے شمار محاکم کے مسلمانوں نے بھی اسے اپنی ڈیوٹیز کی ادائیگی کے دوران اپنا رکھا ہے۔ اور کسی بھی ذمہ دار دینی اتھارٹی نے آج تک یہ فتویٰ نہیں دیا کہ ایسا لباس پہن کر وہ اپنی عبادات ادا نہیں کر سکتے۔

---

(۱) بخاری (۲) ابوداؤد ابن ماجہ

اور یہ لباس ان کے لیے ناجائز وحرام ہے۔ مسلمان کو اسلامی ہدایات کے مطابق ہر ملک کے ماحول اور موسم کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے لباس پہننے کی اجازت ہے یہ کفار وغیر مسلموں کے ساتھ تشبّہ نہیں بلکہ جسمانی اور دینی جائز ضرورت ہے۔

ھٰذا ماعندی واللّٰہ اعلم بالصّواب

وصلی اللّٰہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وسلم

عبدالرسول منصورالازہری

23 اکتوبر 2003ء
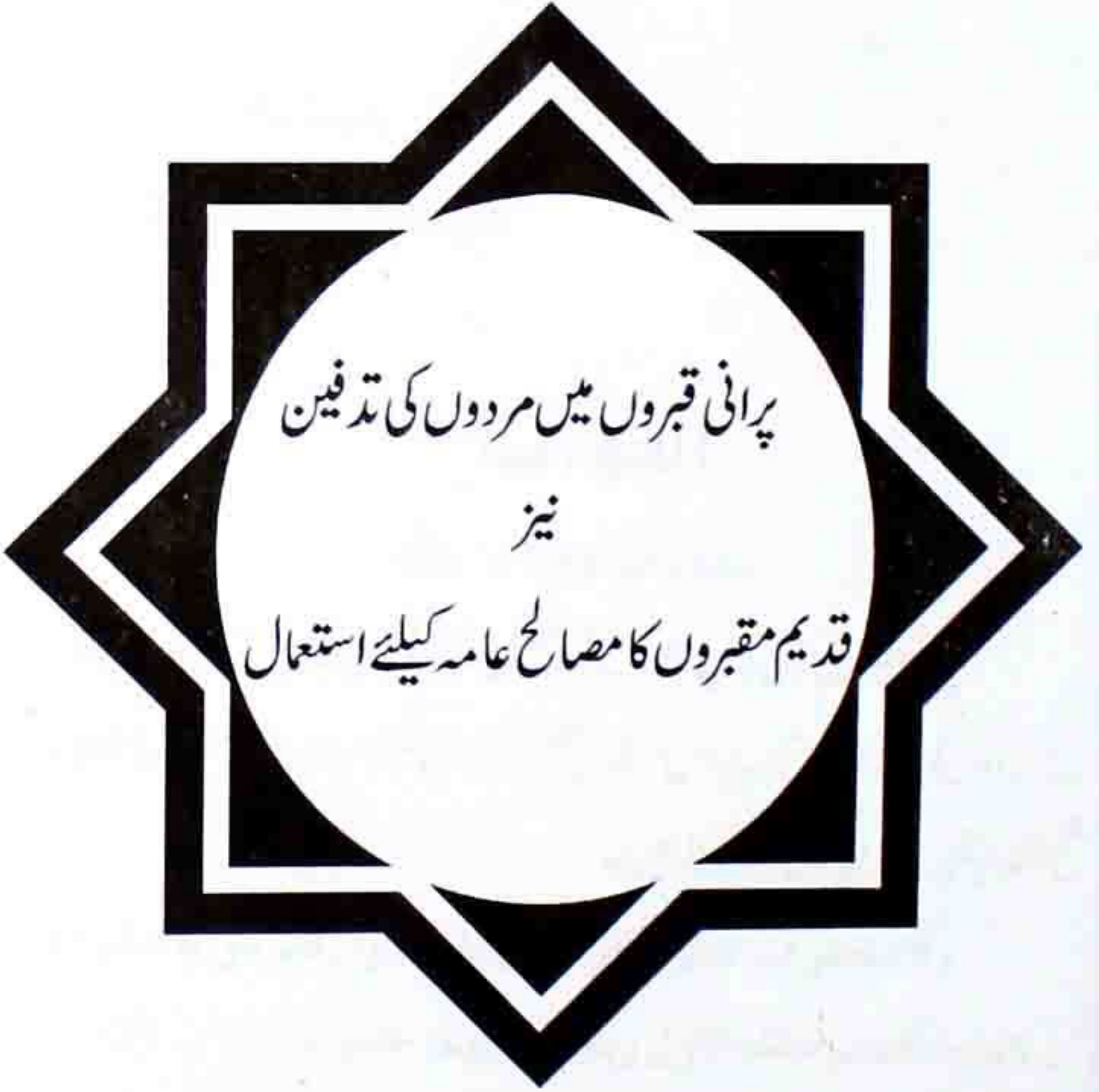
پرانی قبروں میں مردوں کی تدفین
نیز
قدیم مقبروں کا مصالح عامہ کیلئے استعمال

حضرت قبلہ اُستاذی المحترم زید مجدک مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں چند سالوں کے بعد پرانی قبروں میں مردوں کو دفن کر دیا جاتا ہے نیز قدیم مقبروں کو مصالح عامہ اور مقاصد واعمال خیر کیلئے استعمال میں لانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے

والسّلام استفتاء از

ماجد ملک نقشبندی مصباحی

بریڈفورڈ 15 ربیع الاول 1425ھ

الجواب

ماشاء اللّٰہ لاقوۃ الا باللّٰہ

پرانی قبروں میں جب اصحاب قبور تحلیل ہو کر مٹی بن جائیں تو ان قبروں میں نئے مردوں کو دفن کرنا جائز ہے اس مسئلہ پر عظیم فقیہ اسلام امام ابن ہمام متوفی 861ھ فتح القدیر شرح ھدایہ میں رقم طراز ہیں۔

ولا یحفر قبر لدفن آخر الّا ان بلی الاوّل فلم یبق له عظم الّا أن لا یوجد فتضم عظام الأوّل ویجعل بینهما حاجز من تراب (۱)

کسی دوسرے مردے کو دفن کرنے کیلئے کسی قبر کو نہ کھودا جائے ہاں اگر پہلا بوسیدہ اور پرانا ہو چکا ہو کہ اسکی کوئی ہڈی بھی باقی نہ ہو اور اگر بوسیدہ ہڈیاں مل جائیں تو

---

(۱) فتح القدیر شرح الہدایہ

انہیں جمع کر کے ان دونوں کے درمیان مٹی کا پردہ بنا دیا جائے تو یہ جائز ہے مگر پہلی میت کے پرانا ہونے سے پہلے کسی دوسرے کو دفن کرنے کیلئے کسی قبر کو کھودنا یہ مباح نہیں کیونکہ اس میں میت کی ہتک عزت ہے۔حاشیہ ردالمختار میں ہے

وخصوصًا ان کان فیھا میّت لم یبل وما یفعلہ جھلۃ الحفّارین من نبش القبور التی لم قبل أربابھا وادخال أجانب علیھم فھو من المنکر الظّاھر (۱)

اور خصوصا جب اس قبر میں میت ابھی پرانی نہ ہوئی ہو اور جاہل گورکنوں کا یہ فعل کہ وہ ان قبور کو بھی کھول دیتے ہیں جن کے مردے ابھی پرانے نہیں ہوتے اور ان پر دوسرے اجنبی مردوں کو داخل کر دیتے ہیں یہ ظاہراً بہت بری بات ہے۔

امام عثمان بن علی زیلعی متوفی 743ھ رحمہ اللہ اس مسئلہ پر رقم طراز ہیں ولو بلی المیّت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبنأعلیہ(۲) جب میت پرانی ہو کر مٹی ہو جائے تو اسکی قبر میں دوسری میت کو دفن کرنا وہاں کاشت کاری کرنا اور اس پر مکان تعمیر کرنا جائز ہے عظیم فقیہ اسلام علامہ ابن عابدین شامی متوفی 1255ھ رحمہ اللہ نے تو اس مسئلہ پر تفصیل سے کلام کی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ہر میت کیلئے مستقل قبر بنانا کہ اس میں کسی دوسرے انسان کو دفن نہ کیا جا سکے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ اندریں صورت تو پوری زمین پر قبریں ہی عام ہو جائیں گی۔اور خصوصا بڑے بڑے شہروں میں تو ایسا کرنا قطعی ممکن نہیں تو افضل و اولیٰ یہی ہے کہ اس حکم کو میّت کے بوسیدہ اور پرانے ہونے کے ساتھ منسلک کر دیا جائے آپ

(۱) ردالمختار ج ۲ ص ۲۳۳ طبعہ دارالفکر (۲) حاشیہ ردالمختار ج ۲/۲۳۳

ان کلمات سے اپنا موقف واضح فرما رہے ہیں۔

قلت لکن فی ھٰذا مشقّة عظیمة فالاولٰی انا طة الجواز بالبلی اذلا یمکن ان یعّدلکل میّت بحیث لا یدفن فیه غیره لایمکن. والّا لتعمّ القبور الأرض کلّها وخاصة فی المدن الکبرٰی. وان صارا لأول ترابًا لاسّیما فی الأمصار الکبیرة الجامعة والّا لزم ان تعمّ القبور السّهل و الوعر علی ان المنع من الحفر الٰی ان لا یبقٰی عظم عسیر جدًّا......

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب قبور پرانی ہوجائیں تو ان میں دیگر مردوں کو دفن کرنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح وہ قدیمہ قبور جو ایک طویل مدت سے غیر آباد ہیں اور مستقبل میں ان کی آبادی کی امید بھی نہیں ہے ان پر مکان تعمیر کرنا اور انہیں کرایہ پر دینا جائز ہے جس طرح ان کی اراضی کو ٹھیکہ اور ایجارہ پر دینا جائز ہے حتی کہ اصل اراضی وقف کی صورت میں باقی رہے گی اور اس سے آمدن کا سلسلہ جاری رہے گا۔(۱)

عبدالرسول منصور الازہری

25 رمضان المبارک 2004ء

---

(۱) حاشیہ ردالمحتار ج ۳۵۹/۴

زکوۃ کی ادائیگی اور
اسکے مصرف کی صورتیں
فطرانہ کی رقم کی ادائیگی

بخدمت عالی جناب مفتی عبدالرسول منصور صاحب ! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ درج ذیل مسائل میں شریعت اسلامیہ کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں

بندہ مشکور ہوگا۔

1۔ زکوٰۃ کی ادائیگی نقدی کے علاوہ کن اورصورتوں میں کی جاسکتی ہے۔

2۔ کیازکوٰۃ اجتماعی عوامی مفادات کے منصوبوں میں صرف کی جاسکتی ہے؟اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر تملیک کی صورت کیا ہوگی۔؟

3۔ کیا فطرانہ کی رقم صرف عید کے دن ہی مستحقین کو دی جائے یا کہ عید سے قبل اور بعد میں بھی ادائیگی کی جاسکتی ہے۔؟

جزاکم اللہ

المستفتی:

صاحبزادہ سید لخت حسنین

نوشگھم

الجواب واللہ موفق للصواب

نمبر 1: ہر قسم کے وہ مویشی جانور مثلاً گائے اونٹ بھیڑ بکری یا زمین کی پیداوار غلہ اور پھل میوہ جن کی مخصوص مقدار اور تعداد پر زکوٰۃ کی ادئیگی صاحب مال پر واجب ہوتی ہے یہ اشیاء ان کی نقدی و قیمت بلکہ مستحق افراد کی مصلحت و منفعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی مالیّت کی کوئی بھی چیز زکوٰۃ کی ادائیگی میں دی جاسکتی ہے اندریں صورت ضرورت اور حکمت کے تحت کسی بھی مفید صورت کو اپنانا اس عالمگیر دین اسلام کی فطری یسُر و سہولت کے مطابق قرار پاتا ہے۔

جب اہل یمن سے زکوٰۃ کی وصولی کا وقت آیا تو قاضیء یمن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم اجناس میوہ جات اور جانوروں کی جگہ مجھے یمن کی بنی ہوئی چادریں دو کیونکہ فانّہ أھون علیکم و أنفع للمھاجرین بالمدینة

(فقه الزکٰوة یوسف القرضاوی)

اس میں تمہاری آسانی اور مہاجرین مدینہ کی منفعت اور ضرورت کا خیال رکھا جارہا ہے بہر حال فقیر اور مستحق افراد کے حق میں جو چیز زیادہ مفید ہے تو اس چیز کا زکوٰۃ میں دینا ہی افضل ہے۔

نمبر 2: اجتماعی عوامی مفاد کے منصوبہ جات مثلاً سڑکیں شفاخانے مدارس و مساجد وغیرہ پر زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا صحیح اور جائز نہیں کیونکہ قرآن مجید کی سورہ توبہ میں مصارف زکوٰۃ میں ایسے کسی منصوبہ کا ذکر نہیں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے

انّ اللّٰہ لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصّدقات حکم فیھا

فجزأها ثمانية أجزاء

(فقه الزکوٰة یوسف القرضاوی)

صدقات کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ نے نبی یا کسی اور کی مرضی پر نہیں چھوڑا بلکہ خود اس کا فیصلہ فرمادیا چنانچہ اس کے آٹھ مصارف مقرر فرمادیئے کچھ اہل علم حضرات مثلاً امام رازی شیخ رشید رضا مصری، شیخ شلتوت مصری اور امام متولی شعراوی رحمہم اللہ اجمعین نے مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی مدّ میں توسّع اور معنوی کشادگی اختیار کرتے ہوئے ہر قسم کے اجتماعی مصالح اور تقرّب کے کام مراد لئے ہیں جبکہ مسالک أربعہ کے جمہور فقہاء کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد ہے۔

یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مجاہدین وغازیوں پر مال زکوٰۃ خرچ کرنا ہی قرآنی آیت کا منشا ہے اس مقام پر امام قرضاوی کی یہ رائے انتہائی موزوں نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں فی سبیل اللہ کا مدلول متعیّن کرنے میں ایسے توسّع کا قائل نہیں کہ ہر قسم کے مصالح اور تقرّب کے کام اس میں شامل ہوجائیں اور نہ ہی اس کے دائرہ کو اتنا تنگ سمجھتا ہوں کہ وہ صرف عسکری جہاد کیلئے خاص ہوکر رہ جائے جہاد جس طرح تلوار اور بندوق سے کیا جاتا ہے اسی طرح زبان اور قلم سے بھی کیا جاتا ہے جس طرح جہاد عسکری ہوتا ہے اسی طرح جہاد فکری، تربیتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی بھی ہوتا ہے جہاد کی ان تمام قسموں کیلئے مال اور امداد کی ضرورت ہوتی ہے جمہور فقہاء نے اس مدّ کو غازیوں اور دفاعی خدمت انجام دینے والوں کو سامان حرب سے لیس کرنے اور ان کی ضروری امداد کرنے کی حد تک رکھا ہے۔

لیکن ہم موجودہ دور میں دوسری قسم کی جنگ کرنے اور دفاعی خدمت

دینے والوں کا بھی اضافہ کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو اسلام کی تعلیمات اور دعوت اسلامی کے ذریعہ دل ودماغ پر حملہ آور ہوتے ہیں یہی لوگ اپنی جدوجہد اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعہ اسلام کے عقائد اور اس کے شرعی احکام کے دفاع کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔

دورحاضر میں فی سبیل اللہ کا مصرف

جب کسی ملک میں تعلیم اور تعلیمی ادارے MISSIONARY یا لادینیت کے علمبرداروں کے قبضہ میں ہوں تو ایسی صورت میں خالص دینی ادارے کا قیام جس میں مسلمان بچے تعلیم حاصل کریں اور انہیں فکری اور اخلاقی بے راہ روی اور مروّجہ تعلیمی نصاب کے زہریلے اثرات سے بچایا جا سکے بہت بڑا جہاد قرار پائے گا۔

باطل اور غیر اسلامی دارالمطالعوں کے مقابل دینی دارالمطالعوں کا قیام و اہتمام اور اسلامی ہسپتالوں کو معرض وجود میں لانا تا کہ مسلمانوں کو علاج کی سہولت میّسر ہو اور انہیں مشنریز کے پھندوں سے بچایا جا سکے جہاد ہی کے حکم میں ہے۔

موجودہ دور میں جس صورت پر سب سے زیادہ جہاد کا انطباق ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرزمین اسلام کو کفار کی حکمرانی سے جنہوں نے اللہ کی حاکمیّت کی جگہ اپنی حاکمیّت قائم کر رکھی ہے آزاد کرایا جائے اس حقیقت کے پیش نظر سرمایہ دار ہو یا کمیونسٹ اہل کتاب ہو یا لادین جو بھی اسلامی ممالک پر قبضہ کرے گا تو اس کے خلاف جنگ کرنا اور اس جنگ میں مال زکوٰۃ سے معاونت کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے جیسا کہ آج کل فلسطین وکشمیر میں ہو رہا ہے۔

اسلامی حکومت کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

صحیح اسلام کو پیش کرنے کیلئے دعوتی مراکز قائم کرنا جن کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ادیان و مذاہب کی کشمکش کے درمیان غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جا سکے یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

خالص اسلامی پرچہ کا اجراء جو گمراہ صحافت کے درمیان اللہ کا کلمہ بلند کرنے حق کے اظہار اور اسلام پر عائد کئے جانے والے جھوٹے الزامات کی تردید اور مستشرقین حضرات کے شبہات واعتراضات کا ازالہ کرنے میں مؤثر کردار ادا کر سکے بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

کسی ایسی دینی کتاب کی اشاعت جو بنیادی اہمیت کی حامل ہو اور اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کرے جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف ہے۔

پختہ کار، امانت دار اور ذہین ومخلص افراد کی کفالت کرنا تاکہ وہ دین کی خدمت کریں اور دشمنان اسلام کی چالوں کو بے اثر کر کے رکھ دیں عیسائی مشنری کا مقابلہ اور فرزندان اسلام میں بیداری پیدا کریں من جملہ جہاد فی سبیل اللہ ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ زکوٰۃ کے صرف میں ایسے کاموں کو اوّلین اہمیت دیں کیونکہ اسلام کے مددگار اللہ کے بعد فرزندان اسلام ہی ہیں اور خاص طور پر ایسے دور میں جب کہ اسلام غربت سے دوچار نظر آتا ہے۔

رہا مسئلہ تملیک و مالک بنادینے کا تو فی سبیل اللہ کی اس مدّ اور اس مفہوم و مصداق میں اکثر علماء کرام کے نزدیک تملیک ضروری نہیں اور اگر تملیک کو ضروری

شرط قرار بھی دیا جائے تو وہ اس مدّ کے وکیل کے ذریعے سے پوری ہوسکتی ہے ویسے بھی الضّرر یزال اور الضرورات تبیح المخطورات کا قاعدہ اُحناف اور دیگر آئمہ اسلام کے نزدیک مسلّم الوجود اور نافذ العمل ہے۔

نمبر 3 : نماز عید کو نکلنے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا چاہئے فرمان رسول ﷺ ہے

ان رسول اللّٰہ ﷺ أمر بزکاۃ الفطر أن تؤدّی قبل خروج الناس الی الصلوٰۃ (بخاری و مسلم)

آپ ﷺ نے حکم دیا کہ صدقہ فطر لوگوں کے نماز کو نکلنے سے پہلے ادا کیا جائے بخاری و مسلم کی حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں ہے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عید کے دن ایک صاع کھانے کی اشیاء صدقہ فطر کے طور پر نکالا کرتے تھے۔

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عید کے پورے دن میں کسی وقت بھی صدقہ فطر کی ادائیگی صحیح ہے مگر شارحین حدیث نے اس سے عید کے دن کا اوّل حصہ مراد لیا ہے یعنی نماز فجر سے نماز عید تک کا وقت جمہور فقہاء اسلام کے نزدیک نماز کے بعد تک کے لئے اسے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

امام بخاری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ صحابہ عید الفطر سے ایک یا دو دن پہلے صدقہ فطر ادا کیا کرتے تھے حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کے موقف پر آغاز رمضان سے ہی اس کی ادائیگی کا جواز ملتا ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول پر اس کی ادائیگی میں تعجیل سال کے آغاز سے ہی جائز و مباح قرار پاتی ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی زکوٰۃ ہے اس

لئے اس کا حکم مال کی زکوٰۃ جیسا ہی ہے مگر عید کے بعد تک کیلئے مؤخر کرنے سے انسان گنہگار ہوگا اور قضاء لازم ہوگی۔(۱)

والسلام مع الاحترام
عبدالرسول منصور ازہری
امیر شرعی کونسل 7مارچ2003ء

(۱) المغنی ابن قدامہ ج ۳ ص ۶۸ فقہ الزکوٰۃ علامہ یوسف قرضاوی مدظلہ العالی

جمعہ سے پہلے
چار
سنتوں کا ثبوت

جمعہ سے پہلے چار سنتوں کا کیا ثبوت ہے ؟

سید مطلوب حسین شاہ

متعلم ادارہ مصباح القرآن ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نہ صرف یورپ میں بلکہ پورے کرہ ارض پر ملت اسلامیہ کی اکثریت فقہی مسائل میں حضرت امام أبو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی فقہ حنفی جس کی بنیاد کتاب وسنّت قیاس اور اجماع امت پر ہے کی پیروی کرتی ہے۔ فقہ حنفی کے پیروکار نہ صرف عامۃ المسلمین ہیں بلکہ جدید وقدیم مفسّرین ومحدّثین اولیاء کاملین اور اہل بصیرت کی ایک کثیر تعداد اس جادۂ حق پر گامزن نظر آتی ہے ہم آئندہ سطور میں اسی فقہ کی روشنی میں جمعہ سے قبل چار سنتوں کے ثبوت کا مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

محقق امام ابن ہمام سکندری متوفی ۸۶۱ھ فتح القدیر شرح ہدایہ میں سنن ترمذی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

امّا أبو حنیفة فالسنّة عنده بعد ها اربع اخذًا بما روی عن ابن مسعود رضی اللّٰه عنه انّه کان یصلّی قبل الجمعة اربعًا وبعدها اربعًا قاله الترمذی فی جامعه والیه ذهب ابن المبارک والثوری رحمهما اللّٰه.

ترجمہ: امام اَبو حنیفہ کے نزدیک جمعہ کے بعد بھی چار سنتیں ہیں آپ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ جمعہ سے قبل اور جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھا کرتے تھے۔

بحرالرائق میں ہے وحکم الاربع قبل الجمعة کالأربع قبل الظّهر

جمعہ سے قبل چار سنتوں کا حکم وہی ہے جو ظہر سے پہلے چار سنتوں کا ہے۔

احناف کے نزدیک جیسے ظہر سے قبل چار سنتیں ہیں ایسے ہی جمعہ سے قبل بھی چار سنتیں ہیں اگر ظہر سے قبل چار سنتیں رہ جائیں تو فرض کے بعد ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی جمعہ سے قبل چار سنتیں رہ جائیں تو جمعہ کے بعد انہیں ادا کرنا ضروری ہے

احناف فقہاء نے اس حدیث سے بھی جمعہ سے قبل چار سنتوں پر استدلال کیا ہے۔

عن عبداللّٰہ بن السّائب انه ﷺ کان یصلّی اربعًا بعد ان تزول الشمس وقال انها ساعة تفتح فیها ابواب السّماء فاحبّ ان یصعد لی فیها عمل صالح .(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سائب سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ زوال آفتاب کے بعد چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے آپ نے فرمایا یہ ایسی گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں میں پسند کرتا ہوں کہ اس گھڑی میں میرا نیک عمل بھی اوپر جائے۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل، فتح القدیر

حدیث کے الفاظ ان چار رکعتوں کے سنت ہونے کی نفی نہیں کرتے یعنی آپ زوال کے بعد ہمیشہ چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔اگر ان چار رکعتوں سے مراد ظہر کی پہلی چار سنتیں ہوسکتی ہیں تو ان سے مراد جمعہ کی پہلی چار سنتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ ظہر اور جمعہ دونوں زوال کے بعد ہی ادا ہوتے ہیں

وقد صرّح بعض مشائخنا بالاستدلال بعين هٰذا الحديث علٰى أنّ سنة الجمعة كالظهر لعدم الفصل فيه بين الظهر والجمعة(۱)

رہا یہ مسئلہ کہ یہ چار سنتیں کب تک ادا کی جاسکتی ہیں تو کتاب وسنّت کی رو سے اس کا جواب یہ ہے کہ گھر میں یا مسجد میں خطبہ جمعہ کے شروع ہونے سے پہلے ان کا ادا کرنا صحیح اور ضروری ہے دوران خطبہ ان کا ادا کرنا ممنوع ہے

اذا خرج الامام فلاصلٰوة ولا كلام . خروجه يقطع الصلٰوة وكلامه يقطع الكلام . اخرج ابن ابى شيبة فى مصنّفه عن على و ابن عبّاس وابن عمر رضى اللّٰه عنهم كانوا يكرهون الصلٰوة و الكلام بعد خروج الامام .(۲)

ترجمہ: جب امام خطبہ دینے کیلئے نکل آئے تو ہر قسم کی کلام اور نماز ممنوع ہو جاتی ہے حضرت علی ابن عباس اور ابن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین امام کے نکلنے کے بعد نماز اور کلام کو مکروہ سمجھتے تھے۔وہ حدیث بخاری جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دوران خطبہ ایک شخص کو دو رکعت پڑھنے کی اجازت دی وہ حدیث دوران خطبہ نماز

(۱) فتح القدیر (۲) موطا امام مالک، فتح القدیر

ممنوع ہونے سے پہلے کی ہے جیسے ابتداء میں دوران نماز ایک دوسرے سے بات کرنا جائز تھا مگر بعد میں یہ چیز منسوخ کردی گئی۔ ایسے ہی دوران خطبہ جمعہ بھی کلام ونماز منسوخ کردی گئی۔

هٰذا ما عندی والله اعلم بالصّواب وعنده أمّ الكتاب

وصلّى الله تعالىٰ علىٰ حبيبه سيّدنا محمّد واله وصحبه وسلّم

عبدالرسول منصورالازہری

خطیب ریڈچ برطانیہ

10/9/99

حضرت خضر علیہ السلام
اللہ کے
ولی ہیں یا نبی
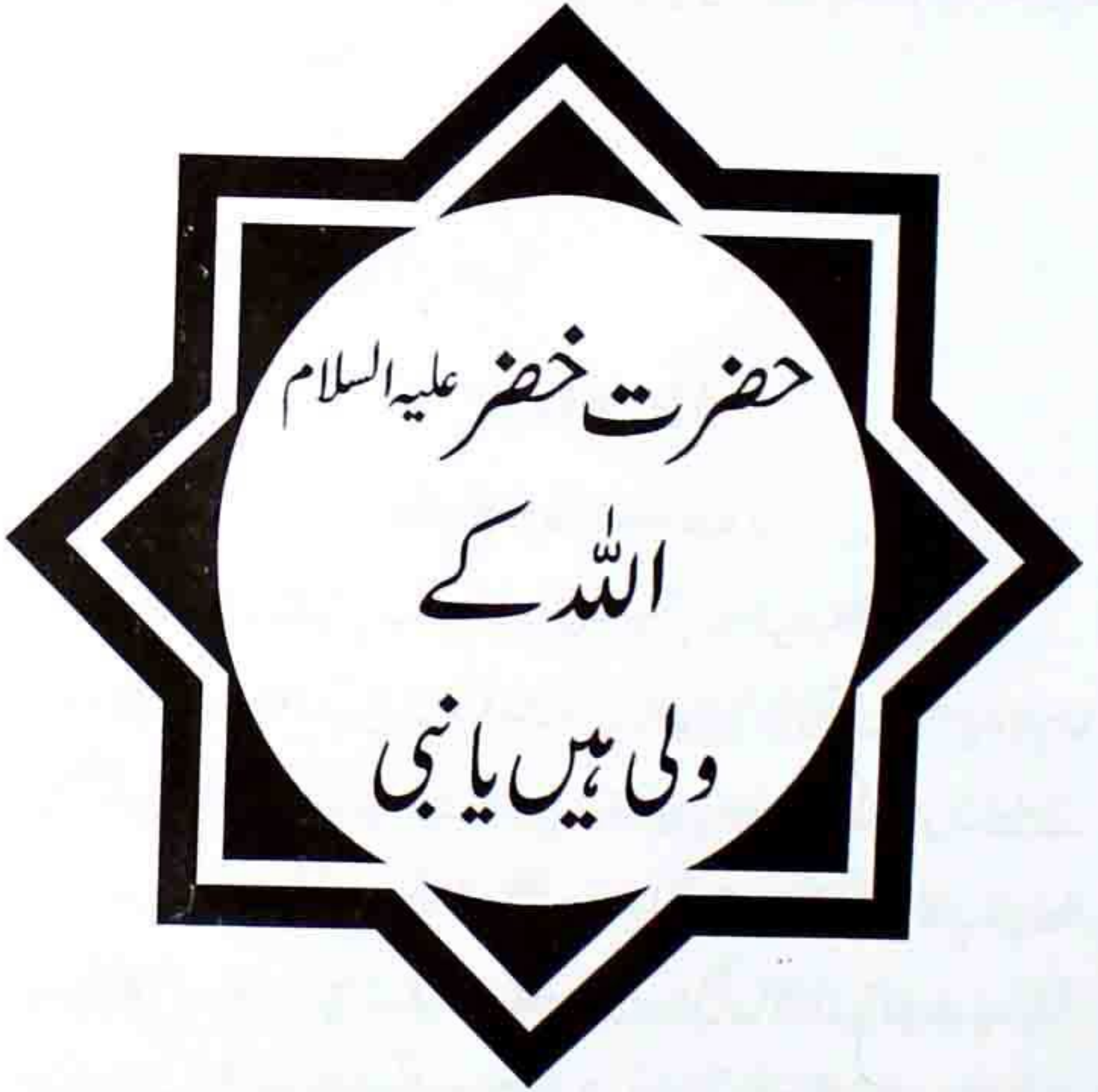
بحضرت استاذی المکرم قبلہ مفتی صاحب ازہری دام فیضہ

حضرت خضر سلام اللہ علیہ کے متعلق بیان کیا جائے کہ آپ اللہ کے ولی ہیں یا نبی؟

استفتاء از

محمد بلال اشرفی مصباحی برمنگھم برطانیہ

الجواب

ما شاء اللہ لا قوۃ الاّ باللّٰہ

حضرت خضر علیہ السلام جمہور اہل علم کے موقف پر نبی نہیں بلکہ فقط ولی ہیں امام الأولیا حضرت الشیخ اُلاکبر ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت خضر کی نبوت کے سلسلے میں اہل ظاہر کے درمیان خلاف پایا جاتا ہے جب کہ ہمارے نزدیک تو قطعی طور پر آپ کا شمار اَولیاَ کرام میں کیا جاتا ہے بعض علماء کرام نے آپ کے نبی ہونے کا قول دیا ہے چنانچہ ولی کامل شیخ زروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عالم کا قول یہ ہے کہ حضرت خضر اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جنہیں دریائی جماعت کی طرف مبعوث کیا گیا تھا جو آپ کی رسالت کا منکر ہے وہ کافر ہے شیخ موصوف اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس عالم کے اس دعوے کو صحیح تسلیم کرنے سے یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی رسالت کا اعتقاد نہ رکھنے والا کافر ہے کیونکہ یہ عقیدہ ایمان میں زیادتی ہے بایں

طور کہ اُمت مسلمہ نے ان کی رسالت پر اجماع واتفاق نہیں کیا۔

عدم نبوت پر دلیل

حضرت خضر سلام اللہ علیہ کی عدم نبوت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ایک بیّن دلیل ہے جب انہوں نے کشتی کا تختہ اکھاڑ کر اسے عیب دار کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا لقد جئت شیئاً امراً بے شک تم نے خلاف شرع کام کیا اور جب انہوں نے ایک چھوٹے بچے کو مار ڈالا تو آپ نے ان سے کہا

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا بے شک تم نے بہت بری بات کی (۱)

اگر آپ نبی ہوتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے بے خبر نہ ہوتے کیونکہ آپ جلیل القدر رسول اور کامل العلم نبی تھے تو ایک نبی اپنے پاس موجود نبی کے مرتبہ ومقام سے جاہل رہے اور اسے غیر نبی گمان کرتا رہے یہ بات انبیاء کرام کے حق میں محال ہے کیونکہ نبی ہونے کی صورت میں ان پر ایمان لانا ہم پر واجب قرار پاتا ہے نیز حضرت خضر نبی ہوتے تو حضرت موسی علیہ السلام کو یہ علم بھی ہوتا کہ نبی معصوم ہوتا ہے تو محال تھا کہ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتے اور امر الٰہی کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے سامنے یہ کہتے کہ تم نے تو بہت بری بات کر ڈالی یہ بات آپ نے اس بنیاد پر ہی کہی کہ انہیں یقین تھا کہ یہ نبی نہیں ہیں کیونکہ نبوت کے ثابت ہو جانے پر اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بہر حال یہ ایک اقویٰ واکبر دلیل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی اللہ نہیں بلکہ ولی اللہ ہیں۔

---

(۱) الکہف

عدم نبوّت پر دوسری دلیل:

قرآن مجید نے حضرت خضر کا قول روایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ أَمْرِیْ اور یہ کچھ میں نے اپنے حکم سے نہیں کیا(۱)

کچھ اہل علم اس قول کو حضرت خضر کے نبی ہونے پر دلیل قرار دیتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس الہام الٰہی سے ہوا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے علم قطعی کے ساتھ ان کے باطن میں القاء کر دیا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں ارشاد فرماتا ہے

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً (۲)

جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا علم لدنّی عطا کیا

یہ فرمان خداوندی بھی آپ کی عدم نبوت پر ایک بڑی دلیل ہے کیونکہ اگر آپ نبی ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ کی یہ وصف فوجدا عبدًا من عبادنا " انہوں نے ہمارے بندوں سے ایک بندہ پایا" بیان نہ کرتا بلکہ اس مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے فوجدا بعض انبیائنا انہوں نے ہمارے انبیاء سے ایک نبی پایا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ علم حاصل کرنے کیلئے مرتبۂ نبوت ہی کافی ہوتا ہے چونکہ آپ نبی نہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے متعلق فرمایا وعلّمناہ من لّدنا علماً " ہم نے اسے اپنا علم لدنّی عطا فرمایا" اسی لئے آپ نے وما فعلته عن أمری " کہ یہ سب کچھ میں نے اپنے حکم سے نہیں کیا"، کہہ کر واضح کر دیا کہ ان باتوں کا قطعی علم اللہ تعالیٰ نے میرے باطن

(۱) الکہف ۸۲ (۲) الکہف ۶۵

میں ڈال دیا ہے جس کی صحت میں مجھے قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں اس بات کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس قول مبارک سے بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ شہد بنانے والی مکّھی کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (۱) اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ جب شہد کی مکّھی کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطریق الہام علم لدنی آ گیا تو اسے اپنے اس فعل میں کوئی شک وشبہ نہ رہا یہی معاملہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آیا۔ (۲)

پھر اکثر علماء اور اصحاب عرفان صوفیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں عظیم محدث شیخ ابو عمرو بن صلاح رحمہ اللہ اپنے فتاوٰی میں فرماتے ہیں کہ حضرت خضر جمہور علماء وصالحین کے نزدیک زندہ ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت خضر والیاس دونوں زندہ ہیں اور ہر سال زمانہ حج میں ملتے ہیں

واللہ اعلم بالصواب وصلی اللہ تعالیٰ علی سیّدنا محمّد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم

عبدالرسول منصور ازہری

7 ربیع الاول 1425ھ

---

(۱) النحل ۶۸ (۲) جواہر المعانی امام علی ابن العربی برادہ ج ۱ ص ۲۳۴ ،فتاوٰی ابو عمرو بن صلاح، تفسیر القرآن صدر الافاضل مراد آبادی رحمہ اللہ

آزر
حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا چچا یا حقیقی والد
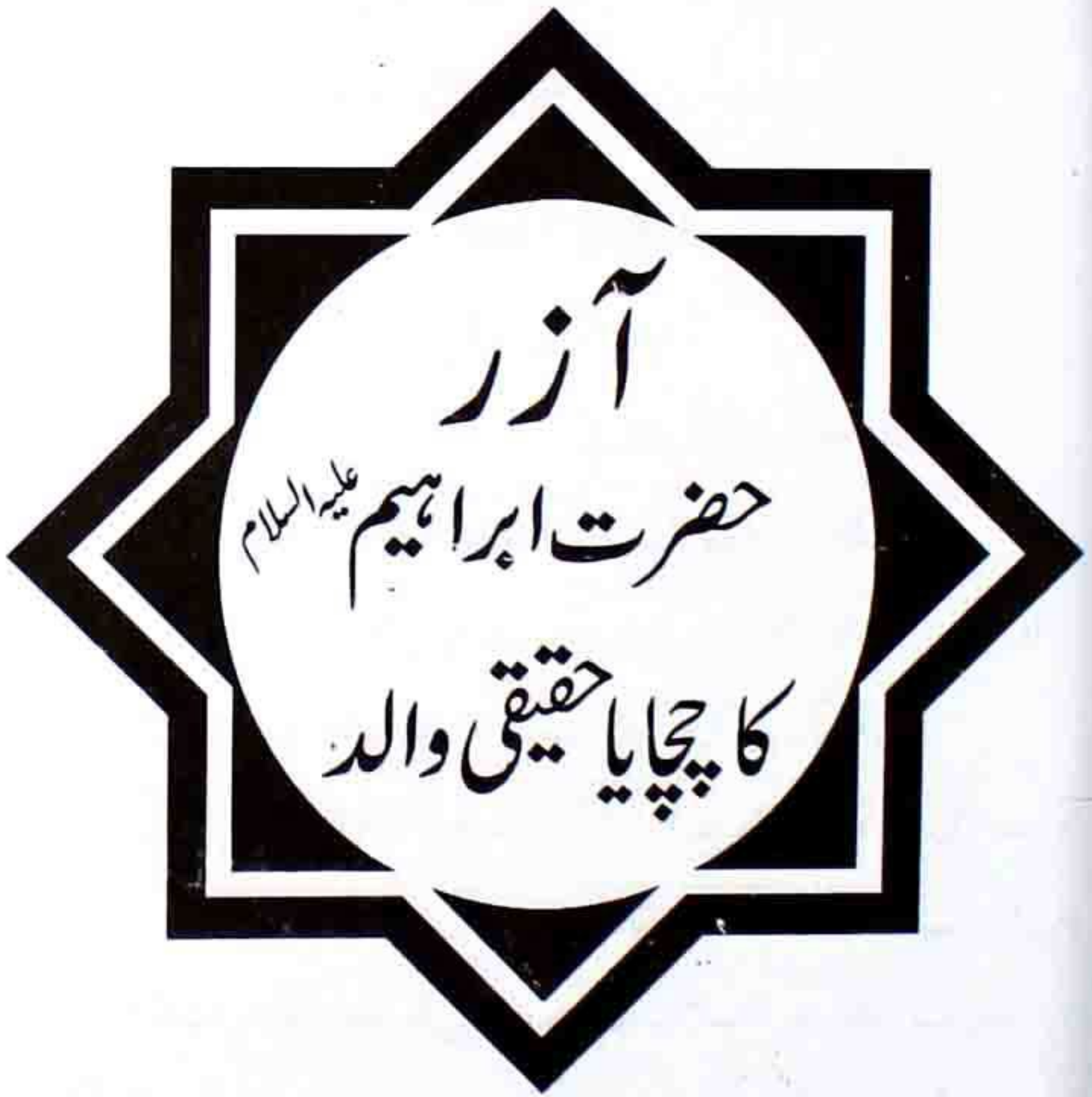
آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ تھا یا چچا؟

اپنی تحقیق کی روشنی میں بیان فرمائیں۔ شکریہ

(مولانا) محمد عبداللہ نقشبندی

خطیب جامع مسجد L.9/135 ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (۱)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو۔

اس آیہ مبارکہ کے معنی ومفہوم سے ظاہراً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آزر نامی شخص جو بت پرستی کرتا تھا وہی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصّلوۃ والسّلام کا حقیقی اور سگا باپ تھا جب کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

مازلت أنتقل من أصلاب الطّاهرين الٰى أرحام الطّاهرات (۲)

میں اول تا آخر پاک باپوں کی پشتوں سے پاک ماؤں کے رحموں میں منتقل ہوتا رہا۔

آپ ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہوا کہ آپ کے سلسلہ نسب میں

---

(۱) الانعام : ۷۴ (۲) السیرۃ النبویہ امام شعراوی مصری ص ۲۰

حضرت عبداللہ تا آدم علیہ السّلام ہر طاہر مرد نے طاہرہ عورت سے عقد نکاح کیا اب اگر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا حقیقی باپ آزر کو مانا جائے اور نبی کریم ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ذرّیت واولاد میں رکھا جائے تو ایک بت پرست کافر اور غیر طاہر شخص کو آپ ﷺ کی طیب وطاہر نسب میں داخل اور شامل کرنا پڑے گا۔ یہی ایک اشکال ہے سورہ توبہ میں اسے بایں انداز بیان کیا گیا ہے

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۱)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کی بخشش چاہنا وہ تو نہ تھا مگر ایک وعدے کے سبب جو اس سے کر چکا تھا پھر جب ابراہیم کو کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے تنکا توڑ دیا

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اپنے باپ کے ساتھ موقف جن آیات قرآنی میں ذکر کیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں صرف ایک آیت کریمہ ایسی ہے جس میں ان کے باپ کے نام کی تصریح کی گئی ہے کہ اس کا نام آزر تھا پھر جب قرآن مجید پر غور وتدبر کیا جاتا ہے تو وہ جب ابوّت (باپ ہونا) کو بیان کرتا ہے تو وہ دو طرح کی نظر آتی ہے ابوّت مباشرہ DIRECTLY اور ابوّت غیر مباشرہ INDIRECTLY انسان کا اپنے باپ کی صلب اور پشت سے ہونا ابوّت مباشرہ ہے دادا بھی ابوّت میں شامل ہے مگر بالواسطہ اور چچا بھی باپ کے ساتھ دادا کے واسطہ سے ابوّت میں مشترک ہے مگر یہ اَب غیر مباشر ہے بایں طور عرب چچا پر بھی اَب کا لفظ بول دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں دونوں قسم کی نصوص موجود ہیں آباً مباشرین

---

(۱) التوبہ : ۱۱۴

ابن، اَب، جد اور جد الجد دوسری وہ نص جو اسکے خلاف ہے جس میں چچا کا ذکر کر کے اسے آباء میں داخل کیا گیا ہے۔

سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے دو قیدی ساتھیوں میں ہونے والی بات چیت کی حکایت کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ(۱)

"یہ ان علموں میں سے ہے جو مجھے میرے رب نے سکھایا ہے بے شک میں نے ان لوگوں کا دین نہ مانا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہمیں نہیں پہنچتا کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں"۔

اس آیت کریمہ میں آبائی کا لفظ اَب کی جمع ہے ان اٰباء کی ترتیب یہ ہے ابراہیم پھر ان کے بیٹے اسحاق پھر ان کے بیٹے یعقوب علیہم السلام یہاں آباء کا لفظ بول کر قرآن مجید نے آباء مباشرین کا ذکر کیا ہے یوسف بن یعقوب، یعقوب بن اسحاق اور اسحاق بن ابراہیم۔

جیسا کہ مسلم شریف کی اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

فیوسف نبی اللّٰہ بن نبی اللّٰہ بن نبی اللّٰہ بن خلیل اللّٰہ (۲)

---

(۱) سورہ یوسف : ۳۷، ۳۸ (۲) صحیح مسلم ۲۳۷۸

دوسری آیت کریمہ یہ ہے

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ م بَعْدِيْ ، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱)

''بلکہ تم میں کہ خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اسی کو جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم واسماعیل اور اسحاق کا ایک خدا اور ہم اس کے حضور گردن رکھتے ہیں''۔

اس آیت شریفہ میں حضرت ابراہیم حضرت یعقوب کے دادا ہیں اور حضرت اسحاق حضرت یعقوب کے والد اور حضرت اسماعیل جو حضرت یعقوب کے چچا ہیں انہیں بھی آپ کا باپ کہا گیا ہے اگر تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام آیات قرآنی میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نسبت سے لأبيه کا کلمہ ارشاد فرماتا ہے تو اس سے مراد آپ کا حقیقی والد ہی ہوتا جبکہ باری تعالیٰ نے صرف ایک بار لابيه آزر ان کا باپ آزر ارشاد فرمایا۔ تو ابوّت کے بعد علَم لانا اسی وقت ہوتا ہے جب مطلقاً چچا مراد لیا جاتا ہے۔ عرب میں یہ بات معروف اور مسلّم ہے کہ جب کوئی کسی بیٹے سے اسکے باپ کے متعلق سوال کرتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے هل أبوك هنا کیا تمہارا باپ یہاں ہے تو وہ اس سے کہتا ہے ليس هنا وہ یہاں نہیں ہے۔ مگر جب وہ اسکے غیر حقیقی باپ مثلاً چچا کے متعلق سوال کرے گا تو وہ یوں کہے گا هل ابوك سعيد هنا کیا تمہارا باپ

(۱) البقرہ : ۱۳۳

سعید یہاں ہے۔

اس وقت وہ ابـوک کے بعد عَلَم اور ذاتی نام اسی لئے لائے گا کہ وہ اس سے اس کا غیر حقیقی باپ مراد لے رہا ہے کیونکہ اگر وہ حقیقی باپ کا ارادہ کرتا تو هــل ابوک هنـا کہنا ہی کافی تھا اس سے ظاہر ہوا کہ ابوّت حقیقی والد اور چچا دونوں میں شائع اور کثیر الاستعمال تھی بہر کیف صرف ایک آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے قول واذقال ابراهیم لابیـه سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا حقیقی اور صلبی باپ نہ تھا بلکہ وہ آپ کا چچا تھا۔(۱)

امام شعراوی کا حتمی موقف

مصر کے عظیم مفسّر قرآن امام متولّی شعراوی رحمہ اللہ اپنی مبسوط تفسیر شعراوی میں اس مسئلہ پر اپنا تحقیقی موقف ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

عـن علی رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه ﷺ خرجت من نـكـاح ولم أخرج من سفاح من لدن آدم الٰی أن ولد نی أبی و أمّی ولم يصبنی من سفاح الجاهلّية شئی (۲)

''حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے میں (دنیا میں) حضرت آدم سے لیکر اپنے والدین تک نکاح کے ذریعہ آیا ہوں زنا اور بدکاری سے نہیں جاہلیّت کی غلط کاری سے میرا دامن پاک رہا۔''

(۱) السیرۃ النبویہ: امام شعراوی مصری ص ۲۲ (۲) الکامل ابن عدی، الاوسط الطبرانی

اس فرمان سے آپ ﷺ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ آپ اس نسب مؤحد، توحید پرست، سے تعلق رکھتے ہیں جس میں شرک وکفر کا کوئی امکان نہیں جبکہ آزر مشرک تھا۔ اور مشرکین کے بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے **انما المشرکون نجس** (مشرکین تو ہیں ہی ناپاک) اب اگر آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا حقیقی والد مانا جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کو اس کی ذرّیت اور اولاد سے ماننا ایک یقینی امر ہے تو میرا موقف یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا چچا تھا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد **ومازلت انتقّل من أصلاب الطّاهرين الٰی ارحام الطّاهرات** ''میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا''

یہ ایک ایسا قول ہے جو اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ آباؤ امّھات ہر دو طرف سے آپ کی نسب شرک سے پاک رہی لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا کہ آزر ابراہیم علیہ السّلام کا حقیقی باپ تھا کسی طور پر بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ تو قطعی مشرک تھا اس کے بعد قرآن مجید کی اس آیت **واذ قال ابراهيم لابيه** کی تفسیر وتاویل ہی کی جاسکتی ہے کہ اس مقام پر اَب سے مراد آزر ہے جو آپ کا چچا تھا اور یہی قرآن مجید کا مفہوم ومقصود ہے قرآن مجید میں معنی ابوت کے استعمالات اور لغت عربیہ بھی اس معنی کی تائید وتصدیق کر رہے ہیں۔(۱)

وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

(10 مئی 2004ء)

---

(۱) تفسیر شعراوی ج ۶ ص ۳۷۴۳ طبعہ اخبار الیوم مصر العربیہ

قبضِ علماء
کے ذریعے سے
قبضِ علم

حضرت قبلہ مفتی الازہری دامت برکاتکم۔

درج ذیل حدیث رسول ﷺ کا صحیح اور اصلی مفہوم اوراس سے ماخوذ فوائد تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں اللہ کریم عزوجل آپ کا حامی وناصر ہو۔۔

عن عبد اللہ بن عمرو ابن العاص قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعًا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسا جھالاً فسئلوا فافتوا بغیر علمٍ فضلوا و أضلوا (بخاری ۹۸)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو بایں معنیٰ قبض نہیں کرتا کہ وہ اسے بندوں سے سلب اور کھینچ لیتا ہے بلکہ وہ علماء کے قبض کر لینے سے علم کو قبض کر لیتا ہے یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہتا تو لوگ جاہلوں کو رئیس اور امیر بنا کران سے سوال کرتے ہیں اور وہ علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں تو وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسرں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

استفتاء از

(علامہ قاری) محمد انور قمر نقشبندی زیدشرفہ

لائی کراس ٹاؤن برطانیہ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس حدیث نبوی کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ علم کا قبض یکبارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے اس فرمان رسول ﷺ سے مندرجہ ذیل فوائد کا ظہور ہو رہا ہے

(۱) آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے علم بایں طور قبض نہیں کرتا کہ وہ اسے بندوں سے واپس لے لیتا ہے بلکہ علماء کے قبض کرنے سے علم کو قبض کرلیتا ہے اہل سنہ کے اس قول اور عقیدے کی روشن دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال کا خالق ہے اور بندہ کاسِب، کیونکہ قبض کا معنی ہے استرجاع، (واپس لے لینا) تو اللہ تعالیٰ وہی چیز قبض کرتا ہے جو اس نے بندے کو عطا کی ہوتی ہے۔ اس کی تائید و تصریح نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارک سے بھی ہو رہی ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (۱) اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں فقہ اور فراست عطا کر دیتا ہے۔ اس فرمان نبوی سے ثابت ہو رہا ہے بندے میں اس عمل کا خالق اللہ تعالیٰ عزوجل ہے اور جہاں تک کسب کا تعلق ہے تو ایک محسوس اور مشاہداتی بات ہے کہ علماء علوم کی تدریس اور ان کو نقل اور رقم کرتے ہیں اور یہی ان کا کسب ہے مگر علماء میں علوم کی تخلیق کرنا یہ الٰہی فعل ہے۔

(۲) اس حدیث مبارک میں مذکور لفظ العلم پر الف ولام عہدی ہے اور اس پر قرینہ آپ ﷺ کا یہ قول ضلوا واضلوا وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ

---

(۱) صحیح بخاری

کیا۔ کیونکہ جس علم سے منع کیا گیا ہے وہ علوم شرعیہ میں داخل نہیں بایں وجہ کہ علوم شرعیہ کے ساتھ ہی ہدایت وابستہ کی گئی ہے باقی علوم شرعیہ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہدایت مطلقہ کا باعث بنتے ہیں نیز اس علم سے کتاب اللہ کا فہم اور نبی کریم ﷺ کی سنت مراد ہے

(۳) ظاہری طور پر تو یہ حدیث آپ ﷺ کے اس قول کے معارض اور مخالف نظر آرہی ہے جس میں آپ نے قرآن مجید کے ایک ہی دفعہ اُٹھ جانے کا ارشاد فرمایا ہے جب آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم نے تو قرآن مجید کو اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھا ہے اپنے صحیفوں میں لکھ رکھا ہے اور اپنے بچوں اور اپنی عورتوں کو سکھا رکھا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا

یأتی علیه لیلة یرفع من الصّدور و المصاحف فلا یبقیٰ فی الصدور و لافی المصاحف منه شیی ء ثم تلا قوله عزّو جلّ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا (۱)

ایک ایسی رات آئیگی کہ قرآن مجید سینوں اور صحیفوں سے اٹھا لیا جائے گا تو سینوں اور صحیفوں میں اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہے گا پھر آپ نے آیہ کریمہ تلاوت فرمائی ....اور اگر ہم چاہتے تو یہ وحی جو ہم نے تمہاری طرف کی اسے لے جاتے پھر تم کوئی نہ پاتے کہ تمہارے لئے ہمارے حضور اس پر وکالت کرتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں قطعاً کوئی تعارض نہیں کیونکہ ائمہ دین سے جو بات منقول ہے وہ یہ ہے کہ علم وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کے دل

(۱) الاسراء: ۸۶ ، درمنثور ۳۳۳/۵

میں رکھ دیتا ہے پھر اسی نور سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا فہم حاصل ہوتا ہے اس پر قرآن اور سنت دونوں شاہد و ناطق ہیں مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ (۱)

اور اگر اس میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور ان سے اسکی حقیقت جان لیتے۔

چنانچہ قرآن کے معانی اور احکام کا فہم اس نور سے ہی اصل ہوتا ہے اور اس نور کے مفقود اور ختم ہونے سے ہی ضلالت اور گمراہی پیدا ہوتی ہے أعاذنا اللہ من ذالک حدیث رسول ﷺ میں ہے أنتم فی زمان کثیر فقهاءہ قلیل قراؤہ تحفظ فیه حروف القرآن وتضیع حروفه .... ویأتی علی الناس زمان قلیل فقهاءہ کثیر قراؤہ تحفظ فیه حروف القرآن و تضیع حدودہ (۲)

''تم ایسے زمانے میں ہو کہ جس میں قرآن کے فقہاء زیادہ اور اس کے قاری کم ہیں اسمیں قرآن کی حدود کی حفاظت کی جارہی ہے اور اسکے حروف والفاظ پر توجہ کم دی جارہی ہے مگر ایک ایسا زمانہ بھی آئیگا جس میں اسکے قاری زیادہ اور فقیہ کم ہوں گے اس وقت اسکے الفاظ پر تو خوب توجہ دی جائے گی مگر اسکی حدود واحکام کو ضائع کیا جائے گا''۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ اس دور کے لوگ قرآن مجید کو سمجھیں گے اور وہ لوگ قرآنی الفاظ کے حفظ وضبط میں اکثریت کے باوجود اسکو

---

(۱) النساء : ۸۳ (۲) الموطا کتاب النداء للصلوۃ ۳۷۹

نہیں سمجھیں گے اور اسکے احکام کی فہم وفراست سے محروم رہیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ نور جو ان کے پاس تھا وہ اس طبقہ کے پاس نہ رہے گا تو ان کا حال بھی ان سابقہ امتوں کی طرح ہو جائیگا جو اپنی کتابوں کے نقل وحمل تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کا حال یوں بیان فرماتا ہے كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۱) گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے۔۔آج کے اس دور میں بھی یہ بات عام ہو چکی ہے کہ کتب اور اسکی نقل وحمل تو کثرت سے پائی جارہی ہے مگر ان حضرات کی تعداد انتہائی کم ہے جو اس علم نور سے بہرہ ور ہیں یہی وہ علم ہے جو آہستہ آہستہ قبض ہوتا جارہا ہے حتی کہ جب مصحف شریف اٹھالیا جائیگا تو اسکے ساتھ ہی وہ نور بھی اٹھ جائیگا کہ جس کے اٹھنے سے وہ لوگ جہالت اور ضلالت میں چلے جائیں گے حالانکہ اُحکام شریعت ان کے پاس کتابوں میں مرقوم ہوں گے مگر وہ اس نور کے ارتفاع اور مفقود ہو جانے سے ان اُحکام کو سمجھ نہ سکیں گے تاہم اصل قرآن کے باقی ہونے میں یہ بشارت موجود ہے کہ قلیل ہونے کے باوجود بھی وہ نور باقی ہے۔

(۴) جب کسی عالم کے قبض ہونے سے کوئی دوسرا عالم اسکے مقام پر کھڑا کر دیا جائے تو کیا وہ دوسرا اسکی مثل ہوگا تو وہ خلا اور کمی جو اسکے اٹھ جانے سے پیدا ہوئی کوئی دوسرا عالم اسے پورا کر دے گا حدیث مبارک کا ظاہری مفہوم تو یہی بتا رہا ہے کہ دوسرا عالم پہلے کی کمی کو پورا نہیں کرتا مگر اسکے مقابل نبی کریم ﷺ کا یہ قول بتا رہا ہے کہ پہلے عالم کے خلاء کو پچھلا عالم پورا کر دیتا ہے

---

(۱) جمعہ : ۵

ارشاد نبوی ہے اذا مات العالم ثلمث فی الاسلام ثلمة لایسدھا الا عالم آخر (۱)

جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اسلام میں ایک رخنہ اور شگاف پیدا ہو جاتا ہے جسے کوئی دوسرا عالم پُر کر دیتا ہے۔ دراصل ان دونوں حدثیوں کے درمیان قطعاً کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب پہلا عالم انتقال کرے گا اور دوسرا اسکے مقام پر آئے گا تو اس سے وہ خلا اور شگاف تو ضرور پُر ہو جائے گا مگر وہ دوسرا بعینہ پہلے کی طرح نہ ہوگا جیسے پیوند لگا ہوا کپڑا صحیح سالم کپڑے کی طرح تو نہیں ہوتا حالانکہ وہ دونوں ستر اور پردے کا کام دیتے ہیں اگر چہ پیوند زدہ کپڑے میں کوئی کمی نہیں ہوتی مگر حتمی طور پر دونوں میں فرق واضح ہو رہا ہوتا ہے خصوصاً جب ہم علم کی تعریف یہ کریں کہ وہ ایک ایسا نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں رکھ دیتا ہے تو اس کا نقص اور گھٹنا تو ایک بدیہی بات ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نور اور تابعین اور تبع تابعین کے نور میں نمایاں طور پر فرق ہے اسی طرح نسلاً بعد نسل اور یوماً فیوماً وہ نور کم ہوتا جا رہا ہے اسی لئے یہ مقولہ بھی معروف ہے کہ اولاً علم مردوں کے سینوں میں تھا پھر وہ اوراق اور کتابوں میں منتقل ہو گیا اور اسکی چابیاں مردوں کے سینوں میں ہی رہیں اور اب اوراق و کتب کی تو کثرت ہے مگر چابیوں کی قلت واقع ہو گئی ہے اگر کوئی چابی ملتی بھی ہے تو وہ صحیح اور مستقیم حالت میں نہیں الا ماشاء اللہ اور اب تو حالت یہ ہے کہ کتاب وسنت کے علوم شرعیہ جن پر ہدایت اور نجات کا دارومدار تھا

---

(۱) بہجۃ النفوس شرح بخاری ابن ابی جمرہ الاندلسی ص ۱۰۷

انہیں چھوڑ کر منطق فلسفہ اور دیگر طبعی سائنسی علوم کو ہی مقصود بالذات تصور کیا جارہا ہے جبکہ سید کائنات نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے **لاتجعلونی کقدح الراکب** (۱) "تم مجھے سوار کے پیالے کی حیثیت نہ دینا۔"

بہر حال نقص علم کا یہ سلسہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا چنانچہ بعض صحابہ کرام سے یہ بات منقول ہے **لم تنفض أيدينا من التراب حين دفنا النبی ﷺ الا وجدنا النقص فی قلوبنا** (۲) نبی کریم ﷺ کو دفن کرنے کے بعد ابھی ہم نے اپنے ہاتھوں سے مٹی نہ جھاڑی تھی کہ ہم اپنے دلوں میں نقص اور کمی محسوس کرنے لگے۔ مگر اس وقت نقص اور کمی کو صرف اہل قلوب اور اصحاب بصیرت ہی پہچانتے تھے پھر قرن ثانی اور قرن ثالث تک بھی یہی کیفیت تھی اس خیر القرون میں علم کا نقص ہو رہا تھا اگر چہ ظاہری طور پر علماء اور کتب کی کثرت سے وہ وافر مقدار میں دکھائی دیتا تھا چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا قول ہے **انی لا سمع منکم فی الیوم اشیاء مرارا لا تبالون بها لنا نعدها فی زمان رسول الله ﷺ من الموبقات** (۳) آج تمہاری طرف سے مجھے ایسی باتیں سننے میں آرہی ہیں جن کی تم کوئی پرواہ ہی نہیں کرتے جبکہ ہم تو دور نبوی میں انہیں ہلاک اور برباد کرنے والی اشیاء شمار کرتے تھے۔ جب اس دور میں قبض علم اور نقص معرفت کا یہ حال تھا تو آج تو یہ مسئلہ روز روشن کی طرح عیاں نظر آرہا ہے

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیّدنا محمد وآلہ وبارک وسلم

عبدالرسول منصور الازہری (22 جون 2004ء)

---

(۱) مجمع الزوائد ۱۰؍۱۵۵، اتحاف السادۃ المتقین ۵؍۴۳ (۲) بہجۃ النفوس شرح بخاری ص ۱۰۸ (۳) بہجۃ النفوس شرح بخاری ص ۱۰۹

علم
اسلام اور صوفیاء کرام
کی نظر میں
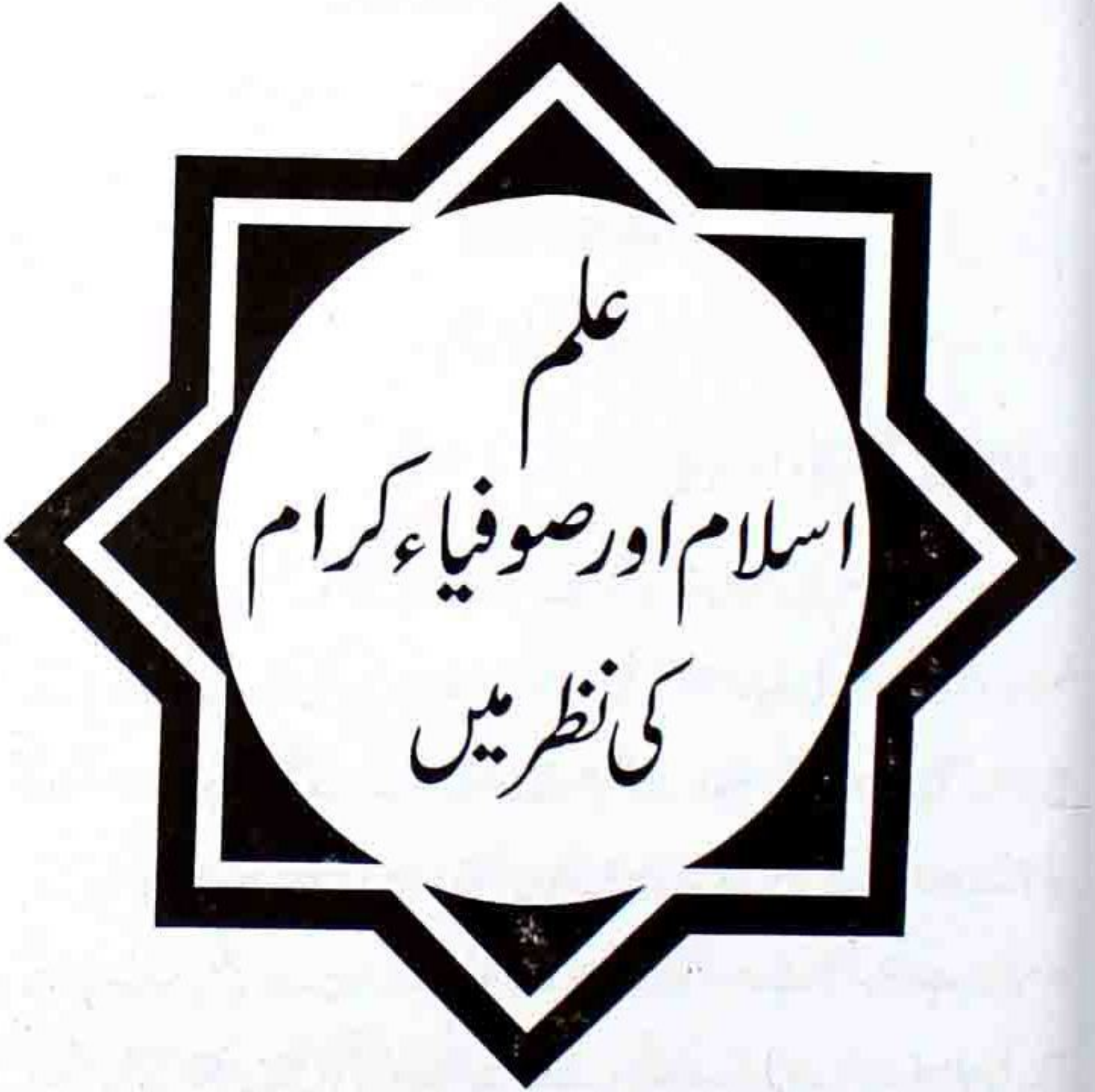
علم اسلام اور صوفیاء اسلام کی نظر میں کیا معنی وحقیقت رکھتا ہے ؟

از

(علامہ قاری) محمد انور قمر نقشبندی

لائی کراس برطانیہ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں علم کا دائرہ کار

دور حاضر میں علم کی جدید تعریف کرتے ہوئے اہل علم نے کہا ہے کہ وہ ضوابط وقوانین جن کی بنیاد استقرأ تجربے اور مشاہدے پر رکھی گئی ہے علم قرار پاتے ہیں اس معنی ومفہوم کے اعتبار سے علم صرف مادی جب سے مختص اور محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے دائرے میں صرف کون یعنی زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہی آتا ہے ماورأ کون قبل از کون اور بعد از کون سے یہ علم جو یورپ اور اس کی جامعات میں ہر طرف دکھائی دے رہا ہے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتا کیونکہ مذکورہ موضوعات استقرأ تجربے اور مشاہدے کے دائرے میں نہیں آتے جب اہل مغرب کے نزدیک علم کا یہی مفہوم ہے کہ جس کی بنیاد ملاحظہ اور تجربہ ہے تو جو شئے اس دارہ کار سے باہر ہے اس کے متعلق انہیں کوئی قطعی حکم اور فیصلہ کرنے کا جواز نہیں اندریں صورت کسی مغربی مفکر اور عالم کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ الوہیت قیامت یا غیبی

امور کا انکار کرے کیونکہ یہ تمام امور اسکے علمی مفہوم کے دارے میں ہی نہیں آتے بایں طور کہ اس کے علم کا دائرہ مادے تک محدود ہے تو وہ غیر مادی اشیاء کا انکار کیسے کرسکتا ہے۔

علم کا اسلامی مفہوم

اسلامی علماء و مفکرین نے علم کا معنی مغربی مفہوم سے وسیع تر لیا ہے ڈاکٹر عبدالحلیم محمود مرحوم شیخ الازہر مصر فرماتے ہیں کہ تمام نافع اور فلاح بخش امور کی معرفت کرنے کا نام علم ہے علم کی اس اسلامی تعریف کے مطابق اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوجاتا ہے کیونکہ اس میں کون ماروا کون وجود مادی اور وجود روحی اور عالم انفس و آفاق کی پوری معرفت شامل دکھائی دیتی ہے۔

علم اور اسلام کا موقف

اسلام میں علم کی غرض وغایت اور آخری مقصد صرف مادے پر ٹھہر جانا ہی نہیں بلکہ وہ مسلمان کو اس سے اعلیٰ ہدف اور ارفع مقصد کی طرف متوجہ کرتا ہے اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (۱)

''اور یہ کہ بے شک تمہارے رب ہی کی طرف انتہا ہے۔''

یورپ نے صرف مادی علوم پر ہی اکتفاء کر رکھا ہے جبکہ اسلام اس پر ٹھہرا نہیں بلکہ وہ اس منزل سے گذرتا ہوا انسانیت کو علم کے دوسرے سرچشمے قلب، روح اور بصیرت کی طرف لے جاتا ہے علم کے ان دونوں مصدروں کا ذکر قرآن مجید کی اس

(۱) النجم : ۴۲

آیہ کریمہ میں مذکور ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱) ''بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے۔''

آیہ مبارکہ میں سمع اور بصر مادی اور تجرباتی علم کی بنیاد ہیں اور دل الہامی علم کی اساس قرار دیا گیا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ مسلم کو جہاں ملاحظے اور تجربے کی طرف متوجہ کرتا ہے وہاں اسے عمدہ خلق، تقویٰ، اخلاص، حب انسانیت اور تعاون علی الخیر کے راستے سے نور قلبی اور ھدایت کی طرف بھی راغب کرتا ہے۔ تہذیب حاضر تو یہی کہتی ہے کہ علم کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں اور خیر و شر سے اس کا کوئی ربط نہیں مگر اسلام علم کی تمام بنیادوں کو خیر کے ساتھ ہی وابستہ کرتا ہے وہ علم کو اللہ تعالیٰ تک رسائی کا وسیلہ اور اسکی عبادت قرار دیتا ہے بہر حال علم اسلام کی نظر میں اس غایت اور انتہا کا نام ہے جس کیلئے نبوت و رسالت کو جاری کیا گیا رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کو قرآن مجید نے متعین کرتے ہوئے تعلیم اور تزکیہ کا ذکر کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲)

''کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انہیں خوب ستھرا فرمائے۔''

رسول اللہ ﷺ کی اس عظیم ذمہ داری کو وحی الٰہی کے اولین کلمات میں پوری وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (۳)

---

(۱) اسراء : ۳۶ (۲) بقرہ : ۱۲۹ (۳) علق : ۱ تا ۵

''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے زیادہ کریم جس نے قلم سے لکھنا سکھایا آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔''

وحی ربانی کا پہلا کلمہ ہی اقراء ہے جو تکرار کے ساتھ آ رہا ہے اور علم کا مادہ بھی بار بار ذکر کیا جا رہا ہے نیز اس پہلی وحی الٰہی میں قلم کا تذکرہ بھی موجود ہے جو تعلیم کا ایک مستقل آلہ اور ذریعہ ہے یونہی پہلی قسم جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن مجید میں کھائی وہ قلم اور اسکے لکھے کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱)

''قلم اور انکے لکھے کی قسم۔''

ان لگا تار آنے والی آیت کریمہ سے علم اور اہل علم کی قدر و منزلت کا ثبوت واضح ہوتا ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران میں اللہ عزّ وجلّ اہل علم کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ (۲)

''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف کے ساتھ قائم ہو کر''۔

اس آیہ مبارکہ میں اللہ جل مجدہٗ نے توحید کی شہادت دینے میں اپنے اور ملائکہ کے ساتھ علماء کا ذکر کر کے اپنے حضور ان کے اعلیٰ مقام کا اعلان فرما دیا بلکہ قرآن

(۱) القلم : ۱،۳ (۲) آل عمران : ۱۸

مجید تو یہاں تک بیان کرتا ہے کہ جس انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نبوت ورسالت سے سرفراز کرتا ہے وہ اس حالت کے باوجود اپنے علم میں اضافے کا سوال کرتا رہتا ہے ارشاد ربانی ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (۱)

''اور عرض کرو کہ اے رب مجھے علم زیادہ دے۔''

بہر کیف قرآن مجید اور سنت نبویہ جس علم کے داعی ہیں وہ وہی علم ہے جو کون ماوراء کون وعقائد اخلاق اور طبعیہ سائنس کے میدان میں نافع اور مفید سمجھا جاتا ہے چنانچہ یہ کہنا کہ دین اور علم کے درمیان تو تعارض اور تخالف ہے بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ دین کا دائرہ ایمان اور علم کا دائرہ مادہ ہے ان میں قطعاً کوئی تصادم نہیں۔

علم اور صوفیاء اسلام

شیخ الازہر امام عبدالحلیم محمود رحمہ اللہ جو اسلامی دنیا میں تصوف وسلوک کے عظیم علمبردار تسلیم کئے جاتے ہیں آپ اپنی بلند پایہ تصنیفات میں جابجا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ صوفیہ کرام کے نزدیک بھی علم کو اسکے اسلامی معنی میں لینا معتبر رکھا گیا ہے آپ فرماتے ہیں۔

والواقع ان العلم فی الدائرة الصوفية هو العلم بمعناه الاسلامی ای العلم بالطبیعة والعلم بما وراء الطبیعة انه العلم بالاخلاق وبالفضیلة وهو علم بالنوامیس الالهیة الساریة فی الکون

---

(۳) طٰہٰ : ۱۱۴

التی یکتشفھا علم التشریح او علم الطبیعة او علم الفلک وغیر ذالک . (۱)

یہ ایک واقعی اور تسلیم شدہ بات ہے کہ صوفی حلقہ میں بھی علم کو اس کے اسلامی معنی میں ہی ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی مادہ اور ماوراء مادہ اور اخلاق وفضائل کا علم اور ان الٰہی قوانین کا علم جو اس کائنات میں جاری وساری ہیں آج کا تشریحی اناٹومی (بدن کو چیرنے پھاڑنے کا فن) فلکی اور غیر فلکی علم منکشف کر رہا ہے۔

اس عنوان پر چند مثالیں رقم کی جارہی ہیں۔

سید الطائفہ ابو القاسم جنید بغدادی رحمہ اللہ

یہ بلند پایہ فقیہ جو اپنے استاذ کے سامنے ان کے علمی حلقہ میں بیٹھ کر فتوٰی دیا کرتے تھے قدیم علماء ومؤرخین ان کے حلقہ درس کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کاتب اور ادیب حضرات ان کی مجلس میں ان کے فصیح وبلیغ الفاظ لکھنے کیلئے حاضر ہوتے فقہاء اسلام ان کی مدلل تقریر سننے کیلئے آتے فلسفی ان کی دقیق نظری اور بلند فکری سے مستفید ہوتے متکلمین ان کی قوت دلیل سے متمتع ہوتے اور اہل حقیقت صوفیا ان کے اشارات اور لطیف حقائق سے فیض یاب ہوتے ایک مرتبہ ابو الحسن علی بن ابراہیم الحداد رحمہ اللہ قاضی ابو العباس ابن شریح کے پاس پہنچے تو وہ اصول وفروع یعنی علم فقہ اور علم توحید پر انتہائی خوبصورت کلام کر رہے تھے ابو الحسن کہتے ہیں مجھے ان کی گفتگو سے تعجب وحیرت ہوئی تو انہوں نے میری اس کیفیت کو بھانپ کر کہا جانتے ہو

---

(۱) موقف الاسلام من العلم والفن والفلسفہ ص ۱۷

یہ سب کچھ کہاں سے ہے میں نے کہا قاضی صاحب خود بتائیں گے تو انہوں نے کہا **هذا ببركة مجالسة ابى القاسم الجنيد** ۔ یہ ابو القاسم جنید بغدادی کے ساتھ مجلس کی برکت کا ثمر ہے۔

امام الصوفیہ حضرت جنید رحمہ اللہ نے علم کی تحصیل میں ایک لمبی مدت صرف کی اور درس وتدریس میں کمال پایا یہ تو ان کے کسبی کمال کا پہلو تھا جب ان سے ان کے وہبی فضل وبرکت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا **من جلوسى بين يدى الله ثلثين سنة تحت تلك الدرجة** یہ اپنے گھر میں اس سیڑھی کے نیچے تیس سال تک اللہ تعالیٰ کے سامنے میرے بیٹھنے کا نتیجہ ہے شیخ موصوف نے حفظ القرآن کے ساتھ علوم القرآن اور علوم الحدیث روایت و درایت سے بایں طور حاصل کئے کہ آپ کو عظیم فقیہ بلند پایہ محدث اور کبیر مفسر قرآن کے الفاظ سے یاد کیا گیا امام قشیری رحمہ اللہ آپ کا ایک مشہور مقولہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔۔۔

جو قرآن کا حافظ نہ ہو اور حدیث رسول کا کاتب نہ ہو وہ اس سلسلے میں مقتدیٰ اور رہنما بننے کا اہل نہیں **لان علمنا هذا مقيد بالكتاب والسنة** . کیونکہ ہمارا یہ علم کتاب وسنت کے اصولوں سے وابستہ ہے۔

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے رسائل کا مطالعہ کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ آپ زھد وتقویٰ کے ساتھ علم وحکمت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے پھر آپ کا وجود صوفیا کیلئے کوئی نئی اور نادر چیز نہ تھی بلکہ آپ کے استاذ اور مرشد روحی شیخ حارث ابن اسد المحاسبی رضی اللہ عنہ بھی اپنے دور میں عدیم المثال تھے آپ کی متنوع اور تحقیقی تالیفات سے امام غزالی رحمہ اللہ نے خوب استفادہ کیا

کتاب الرعایہ اور فهم القرآن بحسب ما وصلنا من نصوص تو آپ کی وہ کتب قیمہ ہیں جسے ہر دور کے محقق علماء نے پڑھا اور سراہا ہے پھر حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ بھی اپنے دور کے عظیم مفسر قرآن علم کیمیاء اور علوم طبیعہ کے ماہر تھے امام قشیری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ آپ نے لغت، اسباب نزول، نحو اور بلاغت کے اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر رقم کی یہی حال حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کا بھی ہے علم وحکمت کی دنیا میں آپ کی بھی نظیر نہیں ملتی پھر علوم وفنون کا بحر بیکنار، عرفان ووجدان کے آسمان کا نیّر تاباں کہ شرق وغرب کے فلاسفر جس کے سامنے طفل مکتب نظر آتے ہیں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رضی اللہ عنہ جو بیک وقت مفسّر، محدّث، فقیہ، اصولی، فلسفی، مصنف اور استاذ الصوفیہ کے منصب پر فائز تھے یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جن پر علم اور اہل علم قیامت تک فخر کرتے رہیں گے۔ اور ان کے علمی سرمائے سے دنیا ہمیشہ فیض یاب ہوتی رہے گی۔

علم کا کسبی اور وہبی پہلو

صوفیاء کرام نے تحصیل علم میں اسکے کسبی پہلو پر ہی اکتفاء نہ کیا کتب اور اساتذہ کتب سے ہی اس کی تعلیم نہ لی بلکہ جب انہوں نے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا

وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (۱)

''اور ہم نے اسے اپنا علم لدنی عطا کیا۔''

---

(۱) الکهف : ۶۵

تو انہوں نے اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے براہ راست عطا ہونے والے اس علم پر مرکوز کر دی اور اس کے حصول کیلئے انہوں نے وہ راستہ اختیار جس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں موجود ہے

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲)

''اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھادیں گے۔''

اس جہاد فی سبیل اللہ سے علم پر عمل مراد ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں بھی مذکور ہے

من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم

''جس نے اپنے علم پر عمل کیا اسے اللہ تعالیٰ دو علم عطا کرے گا جس سے وہ بے خبر تھا۔''

اہل ظاہر اپنے علم ظاہر پر خوش ہو کر اسی پر اکتفاء کرتے ہیں جبکہ صوفیا کرام علماء ظاہر کے ساتھ ان کے علم ظاہر میں بھی شریک ہیں مگر علما ظاہر ان کے الھامات اور اشراقات میں شریک نہیں ہو پاتے اس مسئلہ پر امام غزالی کے علم ظاہر اور ان کے علم باطن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ قطب کبیر امام ابوالحسن شاذلی امام احمد الرفاعی، امام عبدالوھاب شعرانی اور غوث الاعظم حضرت الشیخ عبدالقادر جیلانی کے علم ظاہر اور علم باطن کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے۔۔۔

(۱) عنکبوت : ۶۹

سیدنا غوث الاعظم جیلانی اور احیاء دین

پانچویں صدی کے اس عہد تک عالم اسلام پوری طرح سیاسی وفکری انتشار اور اعتقادی ضعف واضمحلال کی زد میں آچکا تھا اور امت مسلمہ پر تشکیک والحاد اور بے راہ روی کے منحوس سائے منڈلا رہے تھے ایسے میں جہاں امام غزالی کے افکار سے تشکیک کے فتنے کا سدّ باب ہوا وہاں تعلیمات غوثیہ نے بے یقینی اور بے عملی کے مہلک امراض کا مداوا کیا آپ نے توحید کو دلوں میں راسخ کیا اور فرمایا کہ شرک صرف بت پرستی کا نام نہیں بلکہ اپنے نفس کی پیروی اور غیر اللہ کی طلب بھی شرک میں شامل ہے توحید ورسالت کو قول وفعل اور علم وعمل سے عام کر کے حضرت غوث اعظم نے تصوف کی تطہیر وتربیت فرمائی آپ کی ولادت سے قبل عالم اسلام میں باطنی تحریک اور منصور حلاج کی صدائے انا الحق سے تصوف شریعت سے جداگانہ اسرار ورموز کا ملغوبہ بن گیا تھا آپ نے تصوف کو شریعت کے تابع کیا اس طرح حضور غوث پاک نے اصلاح وتجدید اور احیاء دین کا وہ عظیم اور لازوال کارنامہ سرانجام دیا کہ محی الدین کے زندہ وجاوید لقب سے سرفراز ہوئے (۱)

قرآن وحدیث کس علم کے داعی ہیں

کچھ سطحی فکر رکھنے والے حضرات یہ گمان رکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث جسکی طرف دعوت ف یتے ہیں وہ دینی علم ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اسکے ملائکہ رسولوں اور

---

(۱) نام ونسب پیر نصیر گولڑوی ، زبدۃ الآثار

کتابوں ، دینی فرائض مثلاً نماز ، روزہ ، حج ، ضابطہ اُخلاق اور تشریع الٰہی کا علم دینی علم قرار پاتا ہے جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ علم دین اسلام جس کی ترغیب اور تحصیل پر زور دیتا ہے اس سے عقیدہ اخلاق اور تشریع مراد ہے اور اس مرتبے کو اولیت اس لئے حاصل ہے کہ ہر دینی دعوت کی بنیاد ایمان ہی قرار دیا گیا ہے اور انسان کی اللہ تعالیٰ سے معرفت اور بندے اور اسکے مولیٰ سے تعلق و ربط اسکے رسولوں کے واسطے سے ہی معتبر سمجھا گیا ہے کیونکہ جب یہ معرفت اسکے رسولوں کے ذریعے سے ہوگی اسے پورے دینی ماحول میں صدارت اور قیادت حاصل ہو جائیگی کیونکہ یہ قرآن مجید نے ہی بتایا ہے کہ پورا جہان ہی اللہ کے علم اور معرفت کی کتاب ہے اور یہ وہ خدائی قوانین کا مجموعہ ہے جن کا انکشاف و اظہار اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اسکی خشیت میں اضافہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر توجہ کریں ارشاد باری تعالیٰ ہے

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (١)

" رات لاتا ہے دن کے حصہ میں اور دن لاتا ہے رات کے حصہ میں اور اس نے کام میں لگائے سورج اور چاند ہر ایک ، ایک مقرر معیار تک چلتا ہے "

پھر اس مادی عالم کی تنسیق و ترتیب اور اپنی بدیع تخلیق کے بیان کی روشنی میں ہی ارشاد فرمایا

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (٢)

---

(١) الفاطر : ١٣ (٢) الفاطر : ٢٨

''اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں''۔

چناچہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو معرفت کائنات کے مختلف میدانوں میں پہنچا کر انہیں تجسّس وتدبّر کی دعوت دی قرآن حکیم نے معرفت تاریخ کے میدان میں ملت اسلامیہ کو جس عنوان پر غور وتدبر کی دعوت اسے وہ ایام اللہ سے تعبیر کرتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيَّامِ اللّٰهِ (۱)

''اور انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ''۔

قاموس میں ہے کہ ایام اللہ سے مراد اللہ کی نعمتیں ہیں بعض مفسرین نے فرمایا کہ ایام اللہ سے وہ دن مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر انعام کئے جیسے کہ بنی اسرائیل پر من وسلویٰ اتارنے کا دن اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا میں راستہ بنانے کا دن ذیل میں چند آیات الٰہیہ رقم کی جارہی ہیں

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲)

''تم فرماؤ زمین میں سفر کر کے دیکھو اللہ کیونکر پہلے بناتا ہے پھر اللہ دوسری اُٹھان اٹھاتا ہے بے شک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے''۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ (۳)

''تم فرماؤ زمین میں چل کر دیکھو کیا انجام ہوا اگلوں کا ان میں اکثر مشرک تھے''

---

(۱) ابراہیم : ۵ (۲) عنکبوت : ۲۰ (۳) روم : ۴۲

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ (۱)

''تو کیا انہوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے کیا انجام ہوا ان سے اگلوں کا ان کی قوت اور زمین میں جو نشانیاں چھوڑ گئے ان سے زائد تو اللہ نے انہیں انکے گناہوں پر پکڑا اور اللہ سے ان کا کوئی بچانے والا نہ ہوا۔''

اسی طرح قرآن مجید نے اہل اسلام کو معرفت افلاک اور ان میں تدبر و بحث کی دعوت دی اور بعض ستاروں کی قسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی قدر و منزلت کی طرف اشارہ فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ○ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (۲)

تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں تارے ڈوبتے ہیں اور تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ (۳)

''اس چمکتے تارے کی قسم جب وہ اترا۔''

نظام فلکی کی دقت اور اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۴)

''سورج کو نہیں پہنچتا کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات پر سبقت لے جائے اور

(۱) مومن : ۲۱ (۲) الواقعہ : ۷۶/۷۵ (۳) نجم : ۱ (۴) یاسین : ۴۰

ہر ایک ایک گھیرے میں پھر رہا ہے۔

پھر یہ نجوم وافلاک جن کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہم پر احسان واکرام کرتے ہوئے ہمارے لئے ان کو مسخر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱)

''اور تمھارے لئے سورج اور چاند مسخر کئے جو برابر چل رہے ہیں اور تمہارے لئے دن اور رات مسخر کئے۔''

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲)

''اے سننے والے کیا تو نے نہ دیکھا اللہ رات لاتا ہے دن کے حصہ میں دن کرتا ہے رات کے حصہ میں اور اس نے سورج اور چاند کام میں لگائے ہر ایک ایک مقرر میعاد تک چلتا ہے اور یہ کہ اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔''

اس بیان واحسان سے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو اس کائنات میں جاری اپنے قوانین کے اکتشاف اور ان عوالم کی تسخیر کی طرف متوجہ فرما رہا ہے یہ فکر سراسر باطل اور جہالت پر مبنی ہے کہ قمر اور مریخ تک پہنچنا ناممکن ہے کہ اسلام اسکے معارض اور مخالف ہے یہ دین اسلام سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ اسلام نے تو ان کواکب کو ان کے مرتبہ ومقام پر رکھا ہے جبکہ کچھ لوگ انکی تقدیس کرتے ہوئے ان کی

(۱) ابراہیم : ۳۳ (۲) لقمان : ۲۹

عبادت کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت اور انہیں سجدہ کرنے والوں سے کہا

لَاتَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (۱)

''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو اور جوان کا خالق ہے اسے سجدہ کرو۔''

چنانچہ قرآن حکیم نے یہاں تک اعلان فرمادیا کہ پورا جہان ہی تمہارے لئے مسخر کردیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ (۲)

''اور تمہارے لئے مسخر کردیا گیا جو کچھ زمین میں اور آسمانوں میں ہے''

ایسی آیات قرآنی کے مطالعے سے یہ اُمر واضح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُمت مسلمہ کو اپنی اس مرئی (دیکھی جانے والی) کتاب کی دراست اور تحقیق کی طرف متوجہ فرمارہا ہے اس سلسلے میں یہ ارشاد کتنا واضح ہے

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۳)

ابھی ہم انہیں دکھائیں گے اپنی آیتیں دنیا بھر میں اور خود ان کے آپے میں یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ بیشک وہ حق ہے کیا تمہارے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

18 جون 2004ء

---

(۱) حم السجدہ : ۳۷ (۲) لقمان : ۲۰ (۳) (۱) حم السجدہ : ۵۳

مساجد اور دینی محافل
میں
عورتوں کی شرکت

دور حاضر میں عورتوں کا مساجد اور دینی محافل میں شرکت کرنا کیسا ہے؟
شریعت اسلامیہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

ملک محمد یار

چک نمبر 135/9.L ساہیوال

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ان النساء کن فی عهد رسول اللہ ﷺ اذا سلّمن من المکتوبة قمن و ثبت رسول اللہ ﷺ ومن صلی من الرجال ماشاء اللہ فاذا قام رسول اللہ ﷺ قام الرجال:

عہد رسالتمآب ﷺ میں خواتین فرضی نماز کے ختم ہونے پر مسجد سے نکل جاتیں اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے لوگ بیٹھے رہتے جب آپ کھڑے ہوتے تو وہ بھی کھڑے ہو جاتے۔

2: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ان کان رسول اللہ ﷺ لیصلّی الصّبح ینصرف النساء متلفّعات بمروطهن ما یعرفن من الغلس

عہد نبوی ﷺ میں عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی نماز فجر پڑھ کر مسجد سے چلی جاتیں اور اندھیرے کی وجہ سے ان کی پہچان نہ ہوتی

۳۔حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قال رسول اللہ ﷺ انی لأقوم الی الصلوٰۃ أرید أن أطول فیھا فأسمع بکاء الصبیّ فأتجوّز فی صلاتی کراھیۃ أن أشقّ علی أمّۃ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نماز میں قیام کو لمبا کرنے کا ارادہ کرتا ہوں جب بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اُمت پر شفقت اور رحمت کے لیے نماز کو مختصر کر دیتا ہوں

4:حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں لو أدرک رسول اللہ ﷺ ما أحدث النّساء لمنعھنّ المساجد کما منعت نساء بنی اسرائیل :

عورتوں کی یہ حالت وعادت جوانہوں نے اب بنا رکھی ہے اگر آپ ﷺ اپنے عہد مبارک میں دیکھتے تو بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح ان عورتوں کو بھی مسجدوں میں آنے سے منع کر دیتے۔

5:حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں أن نبی اللہ ﷺ قال اذا استأذنکم نسائکم باللّیل فأذنوا لھنّ :

جب رات میں نماز با جماعت کیلئے تمہاری عورتیں تم سے اجازت چاہیں تو انہیں اجازت دے دو۔

شارح بخاری امام ابن بطال رحمہ اللہ اس حدیث پر فرماتے ہیں کہ عورت کو مسجد میں جانے کیلئے اپنے شوہر یا ولی سے اجازت لینا ضروری ہے دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ شوہر یا ولی کیلئے یہی زیادہ مناسب ہے کہ وہ اسے مسجد جانے کی اجازت دے دے اور اسے دینی وروحانی منفعت کے حاصل کرنے سے منع نہ کرے مگر عورت کی مسجد میں حاضری اس اصول پر مبنی ہے کہ اس کیلئے یا وہ خود کسی کیلئے فتنے

ورفساد کا باعث نہ ہو جیسا کہ اغلب طور پر دور رسالتمآب ﷺ کا یہی حال تھا کہ اس وقت عورتوں کی مسجد میں حاضری کسی فتنے اور فساد کا باعث نہ تھی جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی جارہی ہے کہ جب زمانے میں فتنہ وفساد پیدا ہوجائے تو عورتوں کیلئے مسجد میں جانا مناسب نہیں ہے۔

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس حدیث کا مصداق بوڑھی اور عمر رسیدہ عورتیں ہیں کہ جب ایسی عورتیں مسجد جانے کیلئے اجازت طلب کریں تو انہیں منع نہ کرو چنانچہ امام اشہب نے آپ سے روایت کی ہے کہ عمر رسیدہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت ہے مگر آمد ورفت میں کثرت سے کام نہ لے اور جوان عورت بھی کبھی کبھار مسجد میں جاسکتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میں عورتوں کی نماز جمعہ اور فرضی نماز میں حاضری کو اچھا نہیں سمجھتا البتہ عمر رسیدہ عورت کو عشاء اور فجر کی نماز میں حاضر ہونے کی رخصت دیتا ہوں آپ کے تلمیذ ارشد امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بوڑھی عورت تمام فرضی نمازوں میں مسجد جاسکتی ہے البتہ جوان عورت کی مسجد میں حاضری کو میں مکروہ سمجھتا ہوں امام ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ عورت کیلئے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں خواہ وہ عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں کہ عورت زیادہ قریب اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گھر کے اندر ہی ہوتی ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو اسے شیطان جھانکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ عورت کی اپنے گھر میں نماز اللہ تعالیٰ کے حضور اسکی سب سے زیادہ محبوب نماز ہے

سوا حج اور عمرہ کے البتہ وہ عورت جو انتہائی عمر رسیدہ ہو چکی ہو اسے مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔(۱)

اسلامی معاشرے کے قیام اور کتاب وسنت کے مطابق زندگی کے عملی اہتمام میں مرد وعورت دونوں کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے ہر مسلم مرد وعورت کیلئے صحیح اور نافع علم کا سیکھنا از حد ضروری ہے۔

دور نبوی ﷺ میں تحصیل دین اور تزکیہ نفس کیلئے جمعہ عیدین اور جنازہ کے موقعہ کے علاوہ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کیلئے خواتین بھی مردوں کے ساتھ حاضر ہوا کرتی تھیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عدم فتنہ اور پرامن ماحول میں تو عورتوں کو مسجد میں حاضری اور دینی منفعت کے حصول کیلئے مردوں کے ساتھ علمی اور روحانی محافل میں شریک ہونے کی اجازت ہے مگر جب عورت کی زیب وزینت اور بے پردگی اس حد تک چلی جائے کہ وہ اس ماحول میں فتنہ وفساد کا باعث دکھائی دے تو ایسی صورت میں عورت کیلئے مسجد اور مردوں کے کسی بھی اجتماع میں شریک ہونا قطعاً جائز نہیں۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

2 جولائی 2003ء

(شرح صحیح بخاری از امام ابن بطال اندلسی رحمہ اللہ)

قبر کیلئے پختہ اینٹ کا استعمال

نیز

اس پر متوفیٰ کا نام لکھنا

اسلامی شریعت میں قبر کی کیا حیثیت ہے اور اسکی اندرونی جانب میں خاص ضرورت کے تحت آگ پر پکی ہوئی اینٹ استعمال کی جاسکتی ہے نیز قبر پر زائرین کی پہچان کیلئے متوفی کا نام لکھنا شرعاً جائز ہے؟

استفتاء

ازمحمد سلیمان نقشبندی مصباحی برمنگھم

3 مئی 2004ء 12 ربیع الاول 1425ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمان کی قبر میں تدفین اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکریم اور احسان ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے **من ایّ شیء خلقه ٥من نطفة ، خلقه فقدّره٥ ثمّ السّبیل یسّره ٥ثمّ اماته فاقبره ٥**(۱)

اسے کاہے سے بنایا پانی کی بوند سے اسے پیدا فرمایا پھر اسے طرح طرح کے اندازوں پر رکھا پھر اسے راستہ آسان کیا پھر اسے موت دی پھر قبر میں رکھوایا۔

قبر کا اَقل اور کم از کم درجہ ایک ایسا گڑھا ہے جو میت کو چھپا لے اور اسکے بند کردینے کے بعد میت کی بو سے زندوں لوگوں کو اذیت اور تکلیف نہ پہنچے نیز کوئی درندہ جانور اسکے کھودنے پر قادر نہ ہو۔ اور قبر کا اکمل درجہ لحد ہے سمت قبلہ میں قبر میں بنائی ہو

(۱) عبس : ۱۸۔۲۱

سامی جس میں میت کو رکھ کر کچی اینٹوں سے بند کر دیا جاتا ہے اسلامی شریعت میں لحد بنانا افضل و مستحب ہے مگر جب زمین میں ایسی رخاوت اور ڈھیلا پن ہو جس سے لحد کے گر جانے کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں لحد کی بجائے شق بنانا بہتر ہے یعنی پھر وسط قبر میں ایک ایسا مستطیل گڑھا بنایا جائے جس میں میت کو رکھا جائے اور اسکی اطراف کو اینٹوں سے تعمیر کیا جائے اور اسکی چھت کو درمیانی قد کے مرد کی قامت کے برابر اونچا کر دیا جائے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔(۱)

جہاں تک قبر کے اندر آگ پر پکائی ہوئی اینٹ کے استعمال کا تعلق ہے وہ اصلاً مکروہ ہے جسے علماء اسلام نے ناپسند کیا ہے کہ میت کیلئے نیک شگون نہیں ہے البتہ یہ کراہت اس وقت زائل ہو جاتی ہے جب زمین میں رخاوت اور پانی کی کثرت پائی جائے تو اس بنیاد پر قبر میں پکی اینٹ کے استعمال کی بھی اجازت ہے صاحب بدائع صنائع رحمہ اللہ شیخ ابو بکر محمد بن الفضل البخاری کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں

أنه كان يقول لابأس بالآجر في ديارنا لرخاوة الأراضي و كان أيضاً يجوّز دفوف الخشب واتّخاذ التابوت للميّت حتّى قال لو اتّخذوا تابوتا من حديد لم أر به بأسًا في هذه الدّيار (۲)

آپ کہا کرتے تھے کہ ہمارے شہروں میں زمین کے ڈھیلا ہونے کی بنا پر پکی اینٹوں کا استعمال بھی جائز ہے بلکہ آپ میت کیلئے صندوق بنانے اور قبر میں لکڑی کے تختوں کو استعمال کرنا بھی جائز قرار دیتے تھے حتّٰی کہ ان کا یہ قول بھی ہے کہ اگر لوگ میت کیلئے لوہے کا صندوق بھی بنائیں تو ان شہروں میں میرے نزدیک اس

(۱) روایت ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، مجلّہ الازہر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ (۲) مجلّہ الازہر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

میں بھی کوئی حرج نہیں۔

عظیم فقیہ امام شبراملسی رحمہ اللہ نہایۃ المحتاج کے حواشی میں لکھتے ہیں کہ اگر زمین ڈھیلی ہے یا اس سے پانی رستا ہے جس سے میت اور اسکے کفن کو نقصان وفساد پہنچتا ہو تو اینٹوں سے تعمیر شدہ گڑھوں میں بھی میت کو دفن کرنا صحیح ہے ان کے علاوہ کسی اور جگہ پر دفن کرنے کا تکلف جائز نہیں۔ اسی طرح ایک قبر میں ایک سے زائد میت کو دفن کرنا یا شدید ضرورت کے تحت قبور پر دوسری منزل بنانا اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں کثرت اموات اور قلت مدافن سے یہ ضرورت عام ہوتی چلی جارہی ہے اس مسئلہ پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بڑی اہمیت اور جامعیت رکھتا ہے

عن هشام بن عامر رضی اللّٰه عنه قال شكونا الٰى رسول اللّٰه ﷺ يوم أحد فقلنا يارسول اللّٰه الحفر علينا لكلّ انسان شديد فقال رسول اللّٰه ﷺ احضرو وأعمقوا وأحسنوا وادفنواالاثنين فى قبر واحد قالوا ومن فقدّم يارسول اللّٰه قال قدّموا أكثرهم قرآنًا فكان ألى ثالث ثلثة فى قبر واحد (۱)

حضرت ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے غزوہ احد کے روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہر شہید کیلئے قبر کھودنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے تو آپ نے فرمایا قبر کھودو اور اسے خوب گہرا کرو اور ایک قبر میں دو شہیدوں کو دفن کرو صحابہ نے عرض کیا تو مقدم کس کو کریں آپ نے فرمایا جس کے پاس قرآن مجید کا زیادہ حصہ موجود ہو حضرت ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

(۱) ترمذی حدیث حسن صحیح

میرے والد تین میں سے تیسرے تھے جن کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا تھا۔

متوفّی کا نام اسکی قبر پر لکھنا تا کہ اسکی قبر کی پہچان رہ سکے یہ بھی شرعا جائز ہے

اس پر سنن ابوداؤد کی یہ روایت ایک روشن دلیل ہے کثیر بن زید المدنی حضرت مطلب

سے راوی ہیں کہ

لما مات عثمان بن مظعون اخرج بجنازته فدفن أمر النبیؐ رجلا أن ما تیه بحجر فلم یستطع حملها فقام ا لیه رسول اللہ ﷺ وحسرعن ذراعیه ..... کا نی أنظرالٰی بیاض ذراعی رسول اللہ ﷺ حین حسرعنهما ثم حملها ووضعهاعنه راسه وقال لنعلم بها قبر أخی وأدفن الیه من مات من أهلی (۱)

"جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور ان کو قبر میں دفن کر دیا گیا تو نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ کوئی پتھر اٹھالائے اس نے پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اسے اٹھا نہ سکا آپ ﷺ خود اس پتھر کی طرف گئے آپ نے اپنے دونوں بازوؤں سے کپڑا اہٹایا۔۔۔۔۔راوی کہتا ہے کہ میں آپ کے بازوؤں کی سفیدی دیکھ رہا تھا آپ نے اٹھا کر حضرت عثمان بن مظعون کے سروالی جانب پر رکھ دیا اور فرمایا تا کہ ہمیں علم رہے کہ یہ میرے بھائی کی قبر ہے اور اس کے پاس میں اپنے خاندان سے مرنے والوں کو بھی دفن کروں گا"

امام بدر الدین محمود العینی شرح سنن ابو داؤد میں اس حدیث پر رقم طراز ہیں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ علامت اور پہچان کیلئے قبر پر پتھر وغیرہ لگانا جائز

(۱) سنن ابی داؤد، ابن حجر اسناد حسن

ہے نیز اپنے خاندان کے مردوں کو ایک ہی قطعہ اراضی میں جمع کرنا بھی مباح اور جائز ہے چنانچہ جو لوگ قبور پر مردوں کے سروالی جانب میں تختیاں نصب کرتے ہیں وہ بھی اس حدیث کے معنی و مفہوم میں شامل نظر آتا ہے۔(۱)

اس واضح فرمان رسول ﷺ کے بعد ترمذی نسائی اور ابن ماجہ میں مروی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث **نهى رسول الله ﷺ ان تجصّص القبور وأن يكتب عليها**۔ رسول اللہ ﷺ نے قبور کو چونہ گچ کرنے اوران پر لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ تفاخر مباہات اور زیب و زینت کے ارادے پر محمول ہے تعلیم و تعریف کی خاطر قبور پر تختیوں کا نصب کرنا منع نہیں ہے۔ اس بنا پر ہی امام ابو عبداللہ حاکم نے المستدرک میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کا اسناد صحیح ہے مگر اس پر عمل نہیں کیونکہ مشرق سے مغرب تک آئمہ اسلام کی قبور پر ان کے نام وغیرہ لکھے ہوئے ہیں اور یہ وہ عمل ہے جو خلف نے سلف سے لیا ہے سلف سے قبور پر لکھنے کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے امام ابن شبہ تاریخ المدینہ میں فرماتے ہیں کہ یزید بن السائب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عقیل بن ابو طالب نے اپنے گھر میں ایک کنواں کھودا تو اس کے دوران انہیں ایک منقوش پتھر ملا جس پر لکھا ہوا تھا **قبر ام حبيبة بنت صخر بن حرب** تو انہوں نے اس کنویں کو وہیں بند کر دیا اور اس پر مکان بنا دیا حافظ ابو بکر بن ابی الدنیا نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے جو طبع ہو چکی ہے۔(۲)

عبدالرسول منصور الازہری

یکم جون 2004ء

---

(۱) شرح سنن ابوداؤد بدر الدین عینی ج ۶/۱۵۸ (۲) تاریخ المدینہ ابن شبہ ج ۱/۱۲۰

عصر حاضر میں
فقہ اسلامی اور
رؤیت ہلال

مغربی دنیا میں قیام پذیر مسلم اقلیت کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ وضاحت کریں کہ عصر حاضر میں فقہ اسلامی میں اجتہادی فکر کی کس حد تک گنجائش ہے۔

اور کیا تغیر زمان ومکاں سے فقہ میں تغیّر ممکن ہے؟

رؤیت ہلال پر شدید اختلافی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ برطانیہ کے محل وقوع اور اس کے مطلع کی عمومی صورت حال کے پیش نظر شرعی اور اسلامی ماہ کا آغاز ثابت کرنے کی کیا صورت ہے۔

قاری عبدالرؤف

ریڈرچ برطانیہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مغربی کلچر کا سیل رواں اور اسلامی زندگی

مغربی دنیا میں مسلم اقلیت کی طرز حیات اور اسکی اسلامی تہذیب اور دینی ثقافت کا مغربی ماحول کے اثرات وثمرات سے کلّی طور پر محفوظ و مامون رہنا انتہائی مشکل اور یقینی حد تک ناقابل اعتبار نظر آتا ہے۔ یہاں کا ماحول، قانون، طرز زندگی معاشرتی اقدار اسلامی کلچر اور دینی اصول وقواعد کے سراسر خلاف دکھائی دیتی ہے۔ باہمی رضامندی اور فرینڈشپ کے طور پر بدکاری کوئی جرم نہیں مردوزن میں نکاح کے بغیر جنسی اتصال رہے اور حرامی بچوں کی ولادت ہوتی رہے کوئی جرم ہے اور نہ آسمانی ہدایت اور خدائی قانون سے بغاوت اور اگر یہی فعل عدم رضا اور جبر واکراہ سے ہو تو

سنگین جرم قرار پاتا ہے۔ اور پوری انتظامیہ اور عدلیہ اسکے سامنے صف آراء ہو جاتی ہے۔ ہر ادارہ حرکت میں آجاتا ہے۔ اور پورا میڈیا اسے نمایاں طور پر کوریج دیتا ہے جبکہ دونوں صورتوں میں اس قبیح فعل کے اثرات بد سے انسانی سوسائٹی متاثر اور روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت کے خالق کے یہاں تو ایسی کوئی تقسیم نہیں اندرون خانہ پب یا کلب میں شراب نوشی کوئی جرم نہیں بلکہ یہ تو مغربی تہذیب کا حصہ اور نمایاں شعار نظر آتا ہے۔ البتہ شراب نوشی کے بعد غل غپاڑہ کرنا کسی کی زندگی میں مداخلت کرنا اور قومی یا نجی املاک کو نقصان پہنچانا یا مقررہ حد سے زیادہ پی کر ڈرائیونگ کرنا قابل تعزیر جرم قرار پاتا ہے۔ بنیادی ضرورت کیلئے مکان، بزنس یا پرائیوٹ حاجت کیلئے قرضوں کا حصول سراسر سود اور انٹرسٹ نظام پر قائم ہے اندریں حالات مسلم سوسائٹی جو اس نظام کا ایک حصہ بن چکی ہے رواں دواں مقامی معاملات زندگی میں کہاں تک اپنے اسلامی تشخص اور دینی اقدار کو بچا سکتی ہے ہمارا یا ہماری نئی نسل کا مقامی ماحول کے غیر شرعی معاملات سے دامن بچانا انتہائی مشکل کام ہے مسیحی ماحول اور مغربی کلچر میں پروان پانے والی مسلمان نسل کو مسیحی فوج سرکاری وغیر سرکاری اداروں اور ذرائع ابلاغ جن کی کارکردگی اسلام اور اہل اسلام کے خلاف روز روشن کی طرح عیاں دکھائی دے رہی ہے میں جانے اور ان میں ملازمت اختیار کرنے سے کہاں تک روک رکھیں گے اور روکنے کی صورت میں جو خطرناک اور المناک نتائج سامنے آئیں گے کیا ہم انہیں بھگتنے کی ہمت وسکت رکھتے ہیں؟

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

میرے خیال میں اگر مسلم اقلیت نے مسیحی دنیا کے اس مرکز میں رہنا ہے تو ہمیں آج سے ہی اپنے دینی فہم اور فقہ اسلام میں مجددانہ اور مجتہدانہ اَنداز میں سوچنا اور عصر حاضر میں دین اسلام کی حقانیت کے اظہار اور اس کی بالا دستی کو قائم رکھنے کیلئے راہ اعتدال نکالنا ہوگا۔ جس سے ہم امت نبویہ کی زیادہ سے زیادہ منفعت اور اسکی یسر و سہولت کے پہلو کو اجاگر کرسکیں اَرباب فکر و نظر پر تو یہ بات مخفی نہیں کہ دین اسلام ہر دور کے انسانوں کی فطری ضرورت اور عملی ہدایت کا سامان لیے ہوئے ہے اور یہ ایک آفاقی غیر منسوخ اور غیر متبدّل ضابطہ حیات ہے شریعت محمّدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت اور اس کی اساس میں کوئی تحریف و تبدّل ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ البتہ ہر دور میں زمان و مکان کے تغیّر سے انسانی اور عملی تقاضوں کے ساتھ اور اس کے اندر جاری ہونے والے عرف، عادات اور لوگوں کے تعامل کے پیش نظر اسکی تفسیر و تشریح اور فقہ اسلامی کے اندر نئی تعبیر کا پیدا ہونا ایک لازمی اور فطری اَمر ہے۔

آئمہ اسلام اور مجتہدین کرام کے اقوال و فتاوٰی اور ان کا نصوص شریعت کے اندر رہ کر اجتہاد و استدلال کرنا ہمارا اسلامی ورثہ ہے۔ مگر حالات، عرف اور تعامل کے تغیّر اور انسانی عادات میں تبدیلی واقع ہونے سے ان کے اجتہاد کا تبدیل ہوجانا بھی ہماری دینی تاریخ کا زّریں باب ہے دنیائے اسلام کے امام اَعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اپنے بعض فتاوٰی سے رجوع کرنا فقہ اسلامی میں تغیّر کی روشن دلیل ہے۔ کچھ عرصہ تک آپ کپڑے سے بنی ہوئی جرابوں پر مسح کے جواز کے قائل نہ تھے۔ جبکہ آپ کے شاگرد امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ اس وقت بھی کپڑے سے بنی ہوئی جرابوں پر مسح کے جواز کا فتوٰی دیا کرتے تھے۔ مگر جب آپ بیمار ہوئے تو آپ نے

کپڑے کی جرابیں پہن کران پر مسح کرنا شروع کر دیا آپ کی عیادت کیلئے آنے والے لوگوں نے اس تبدیلی کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا جائز ہے۔ كنت أمنع الناس پہلے میں لوگوں کو منع کیا کرتا تھا اب میں نے اس قول سے رجوع کرلیا ہے۔ اسی طرح حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بغداد وعراق سے واپس مصر میں رہائش پذیر ہونے کے بعد کچھ اقوال سے رجوع فرمالیا۔ آج بھی فقہ شافعی میں قول قدیم اور قول جدید آپ کی طرف منسوب ہیں۔

دورحاضر میں اجتہاد ناگزیر ضرورت ہے۔

ہمارے اس محیرّ العقول سائنسی اور علمی دور میں اجتہاد ضروری بھی ہے اور فرض بھی ہماری فقہ اسلام اور فہم دین میں اتنی طاقت، وسعت اور مسلسل حیات ہو جو عصر حاضر کی تمام ضرورتوں کی کفیل ہو جو ہر لحہ تغیرّ پذیر انسانی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کر سکے شریعت اپنی محکم نصوص قطعی اُحکام اور قواعد کلّیہ کے ساتھ تو قائم ودائم ہے مگر فقہ جو ہماری بشری فہم وفراست کا عکس جمیل ہے۔ جس سے ہم اُحکام شریعت کو اس کے تفصیلی دلائل سے استنباط کرتے رہتے ہیں وہ ہمارے تغیرّ سے متغیرّ ہوتی رہتی ہے۔ جس میں تغیرّ زمان تغیرّ مکان اور تغیرّ حال سب کچھ شامل ہے چنانچہ شریعت اور فقہ میں فرق یہ ہے کہ شریعت قانون خداوندی اور وحی الٰہی ہے اور فقہ وحی کی روشنی اور اس کے زیر سایہ عقل کا اسلامی عمل ہے۔

امام اُعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور آپکے وصال کے بعد امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال وفتاوٰی میں اختلاف کا سبب حجّت اور برھان نہ تھا بلکہ زمان ومکان کا تغیرّ

اور اختلاف تھا۔ اگر امام موصوف بھی وہی کچھ دیکھتے اور ان حالات و عادات سے گزرتے جن سے آپ کے شاگردوں کو واسطہ پڑا تھا تو آپ کا قول بھی وہی ہوتا جو آپ کے شاگردوں کا تھا۔ اور آج تو ہمارے اور اس اجتہادی دور کے درمیان کئی صدیاں حائل ہو چکی ہیں اس دور میں تو زندگی ساکن اور بہت کم تغیّر پذیر تھی۔ مگر ہمارے اس عصر جدید میں تو زندگی کی تمام تر اَقدار و اَوضاع ہی بدل گئی ہیں اقتصادی سیاسی، ادارتی، دستوری اور بین الاقوامی تعلّقات غرضیکہ سب کچھ ہی نیا نظر آرہا ہے آج اگر قرون اولیٰ کا کوئی انسان قبر سے اٹھ کر ہمیں دیکھے اور ہماری زندگی کا مشاہدہ کرے تو وہ ہر چیز کا انکار کر ڈالے وہ خود کو یا پھر ہمیں مجنون اور پاگل قرار دے بہر حال شئون حیات میں یہ بنیادی تغیّر ہم سے جدید فقہ اور جدید اجتہاد کا تقاضا کرتا ہے جو زندگی کے ساتھ متحرّک رہے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اسکی شرع کے ساتھ منسلک رکھے یہی اس دین کا منشا بھی ہے۔ اور انسانی فطرت کا تقاضا بھی۔

تغیّر زمان و مکان سے فقہ میں تغیّر

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا

خذ الحب بالحب والشاة من الغنم و البعير من الابل غلّے کے بدلے غلّہ بکریوں سے بکری اور اونٹوں سے اونٹ وصول کرنا مگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس حکم سے جو مفہوم اَخذ کیا وہ یہ تھا کہ امت پر یسر و آسانی پیدا کی جائے تو آپ نے زکوٰۃ کی وصولی پر اَہل یمن سے کہا کہ تم لوگ مجھے غلّے کے بجائے یمن کی بنی ہوئی چادریں اور شالیں دو فانه أهون عليكم و أنفع للمهاجرين بالمدينة اس

میں مہاجرین مدینہ کا بہت زیادہ نفع ہے اور تمہارے لئے آسانی بھی اس طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے امت کی مصلحت و منفعت اور شریعت کی غرض و غایت کو پیش نظر رکھا اور یہی وہ فقیہانہ بصیرت اور مومنانہ فراست ہے جس نے اسلامی تعلیمات کو ہر دور میں زندہ و تابندہ رکھا اور عقل سلیم اسکی حقانیّت اور افادیّت پر مہر تصدیق ثبت کرتی رہی۔

عہد رسالت مآب ﷺ اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم کے دور تک صدقہ فطر کی وصولی غلّہ اور میوہ کی صورت میں ہوتی رہی اور حکم بھی یہی تھا۔ مگر بعد میں اہل علم اور آئمہ اسلام نے اسکی قیمت و نقدی کے جواز پر اتفاق کرلیا جو آج تک جاری و ساری ہے۔ کیونکہ اس میں فقراء اور مستحق حضرات کی منفعت اور ان کے یسر کا پہلو زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

زمانے میں تغیّر اور ہر میدان میں حیران کن ترقی کے ساتھ سفری سواریوں اور مسافت کے اصولوں میں بھی انقلاب آگیا مہینوں کی مسافت گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہونے لگی یہی وجہ ہے کہ چاروں فقہی مذاہب کے مجتہد اور محقق علماء نے عدم فتنہ اور راستے کے پر امن ہونے پر بغیر محرم کے عورت کو سفر حج کی بھی رخصت دے ڈالی یہ سب کچھ نصوص شریعت میں گہری بصیرت کے ساتھ فقہ اسلامی میں تغیّر کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ امام ابو محمد قیروانی فقہ مالکی کے عظیم امام رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ میں اپنی رہائش گاہ پر رکھوالی کیلئے ایک کتا پال رکھا تھا۔ جب لوگوں نے آپ سے کہا کہ حضرت امام تو اسے سخت مکروہ سمجھتے تھے۔ تو آپ نے کہا لو کان مالک فی زماننا لاتخذ اسدا ضاریا اگر امام مالک رضی اللہ عنہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو رکھوالی

کیلئے دھاڑنے والا شیر پالتے (۱)

اسلامی عبادات ومعاملات رؤیت ہلال سے وابستہ ہیں۔

انسانی آنکھ یا مشاہدہ فلک کیلئے استعمال ہونے والے جدید آلات کی مدد سے رؤیت قمر اور ظہور ہلال سے ہی شرعی اسلامی ماہ کا آغاز اور دینی عبادات کا سلسلہ وابستہ کیا گیا ہے۔ حساب آبزرویٹری پر قطعی عمل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے جسے دور حاضر کے ماہر فلکیات علامہ ڈاکٹر عبوالوہاب مراکشی نے یوں بیان کیا ہے۔

وعلی کل حال فقد علمت من ذالک ان الحاسب انما یعمل بحسابه علی القول به فی صورة ولعدة وهی ماذا اول الحساب علی ان الهلال موجود وانما منع من رؤیته نحو السحاب (۲)

جب حساب اس بات کی نشاندہی کرے کہ چاند موجود ہے مگر بادل وغیرہ کی وجہ سے اس کی رؤیت نہیں ہو رہی چنانچہ یہی بات علامہ سبکی شافعی رحمہ اللہ نے بھی کہی وہ فرماتے ہیں۔

واجمع المسلمون فیما اظن علی انه لا حکم لمایقوله الحاسب من مفارقة القمر الشمس اذا کان غیر ممکن الرؤیة لقربه منها۔(۳)

امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حساب دان کے اس قول کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ قران شمس وقمر کے بعد چاند کی رؤیت ممکن نہ ہو جائے۔

---

(۱) تیسیر الفقہ علامہ قرضاوی ص ۱۷۵ (۲) العذب الزلال ص ۲۱۴ (۳) العلم المنشور ص ۶

علامہ شیخ بخیت رحمہ اللہ نے بھی اپنے رسالہ میں صفحہ ۲۱۶ پر یہی قول ارشاد فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد جب چاند کی رؤیت اور ظہور ہلال کا امکان نہ ہو روزے کے وجوب اور اس کے جواز کا کوئی اعتبار نہ ہوگا کیونکہ عدم امکان رؤیت کی صورت میں تو تمام متقدمین علمائے اسلام کی مخالفت ہوجاتی ہے جن کا اجماعی فیصلہ یہی ہے کہ

لا ثبت الصوم بمجرد وجوده اذالم تمكن رؤيته او تعسرق الا تفاقهم على ان الشارع اناط الحكم بالرؤية بعد الغروب انما الخلاف بينهم فى انه يكفى رؤيته لولا المانع بان دل الحساب على ذالك اولا بد من رؤية بالفعل

جب تک ہلال کا ظہور نہ ہو صرف وجود ہلال سے روزہ ثابت نہیں ہوگا کیونکہ صاحب شریعت نے روزے کا حکم غروب آفتاب کے بعد رؤیت قمر سے وابستہ کر دیا ہے۔

البتہ ان حضرات کے درمیان اس امر میں خلاف واقع ہوا ہے کہ عدم مانع کی صورت میں جب حساب رؤیت ہلال کی تائید کر دے تو وہ رؤیت معتبر ہوگی۔ یا اس کیلئے بالفعل رؤیت ضروری ہے۔

علامہ امام بن دقیق العید شرح عمدہ صفحہ ۲۰۶ ج ۲ میں اپنے موقف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اول اذادل الحساب على ان الهلال قد طلع من لا فق على وجه يرى لولا وجود المانع كالغيم مثلا فهذا يقتضى الوجوب لوجود السبب الشرعى و يسن حقيقة الرؤية بمشروطة فى اللزوم لان الاتفاق على ان المحبوس فى المطمورة اذا علم

بالحساب باکمال العدة او بالاجتهاد با لا مارات ان الیوم من رمضان وجب علیه الصوم وان لم یر الهلال ولا اخبره من راٰه (۱)

جب حساب اس بات کو ثابت کر دے کہ ہلال مطلع پر نمودار ہو چکا ہے بایں طور کہ اگر بادل وغیرہ کا عارضہ نہ ہو تو دیکھا جا سکتا ہے تو اس شرعی سبب کے پائے جانے سے ایسا ہلال روزے کے وجوب کا تقاضا کرے گا اور رؤیت کا حقیقی معنی انسانی آنکھ سے دیکھنا۔ روزے کے وجوب ولزوم میں شرط نہیں ہے کیونکہ علماء نے اس بات کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا ہے کہ زمین دوز قید خانے میں انسان اکمال عدت یا علامات کے ساتھ اجتہاد کر کے حساب سے معلوم کرے کہ آج رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہے تو اس پر روزہ رکھنا واجب ہوگا۔ اگرچہ اس نے چاند کو نہ دیکھا اور نہ ہی کسی چاند دیکھنے والے نے اس کو چاند کی خبر دی۔

نماز اور روزے کے وجوب کا سبب متحد نہیں

امام القرافی رحمہ اللہ نماز اور روزے کے وجوب کے سبب میں فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز ظہر کے وجوب کیلئے زوال شمس کو سبب قرار دیا ہے اور یہی صورت حال بقیہ نمازوں میں بھی پائی جاتی ہے تو جو شخص کسی طریقے سے بھی یہ سبب معلوم کرے اس پر نماز واجب اور لازم ہو جائے گی۔ اسی لئے صحیح اور مفید حساب کا بھی قطعی طور پر اعتبار کیا گیا ہے مگر ہلال کا سورج کی شعاع سے نکلنا روزے کا

---

(۱) شرح عمدہ ج ۲ ص ۲۰۶

سبب نہیں بلکہ شعاع شمس سے نکل کر رؤیت ہلال کو اس کے وجوب کا سبب قرار دیا گیا ہے جب تک رؤیت نہ ہوگی شرعی سبب نہ ہوگا اور جب تک شرعی سبب نہ ہوگا روزے کا حکم ثابت نہ ہوگا اس پر یہ قول رسول اللہ ﷺ ایک قطعی اور بیّن دلیل ہے۔

صوموا لرؤية الهلال وافطروا لرؤيته

چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر ہی افطار کرو

ولم يقل لخروجه عن شعاع الشمس

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ چاند کی شعاع شمس سے نکلنے پر ایسا کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے متعلق فرمایا ہے

اقم الصلوة لدلوك الشمس

سورج کے ڈھلنے سے نماز کو قائم رکھ۔

عظیم فقیہ ڈاکٹر حسن مقصود کا موقف

ذالك أن الهلال في ساعات ولادته الاولىٰ تستحيل رؤية بالعين المجردة بل ربما استحالت رؤية بالوسائل البصرية فهو في علم الله مولود وفي الحساب النظري العقلي مولود ولكننا لا يلزمنا الصيام في هذه الحالة اتفاقا لعدم امكانية الروية التي انيط بها وجوب الصيام و ثبوت الشهر ونظير هذا في الفقه المجمع عليه زوال الشمس عن كبد السماء الذي انيط به وجوب صلٰوة الظهر فانّ الشمس بعد استوٰاها بمعشاء الثانيه مثلا تزول عن كبد السماء فوقت

الظهر قد دخل في علم الله كما انه دخل بالحساب العقلي النظري الا ان الصلاة لا تجب على المكلّف اتفاقا حتى يرى آثارزوالها في الظل ،اذا فمتى يمكن رؤية الهلال ان رؤية الهلال لا يمكن ان تقع الا بعد مرور زمان محدود على ولادة الهلال بحيث بصيرمن الحجم أو المساحة بحيث تمكن رؤية وهذا لا يستطيع الحاسب ان يضع له ضابطازمينا دقيقا مطرد الاختلاف ذالك بكثير من العوامل الفلكية والجوية (۱)

ہلال اپنی ولادت کی پہلی ساعتوں میں ایسی پوزیشن میں ہوتا ہے کہ محض انسانی آنکھ سے تو درکنار جدید بصری وسائل سے بھی اس کی رؤیت محال ہوتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور حساب نظری اور عقلی کے مطابق تو پیدا ہو چکا ہوتا ہے مگر ایسی حالت میں بالاتفاق ہم پر روزہ واجب نہیں ہوتا جس کی وجہ عدم امکان رؤیت ہے کیونکہ رؤیت ہلال ہی وہ حقیقی سبب ہے جس کے ساتھ روزے کا وجوب اور مہینے کا ثبوت وابستہ کیا گیا ہے۔اس کی اجماع فقہ میں مثال وسط آسمان سے آفتاب کا زوال ہے جس کے ساتھ نماز ظہر کا وجوب منسلک کردیا گیا ہے۔ کیونکہ آفتاب وسط آسمان میں پہنچ کر جب سیکنڈ کا دسواں حصہ مثلاً وسط آسمان سے زوال پذیر ہوتا ہے تو علم الٰہی اور حساب عقلی نظری کے مطابق تو ظہر کا وقت داخل ہو جاتا ہے مگر جب تک زوال

---

(۱) فقہ الصیام دار البشائر الاسلامیہ بیروت ص ۳۱

آفتاب کے آثار سائے میں نظر نہ آجائیں مکلف مسلمان پر بالاتفاق نماز ظہر واجب نہیں ہوتی تو پھر رؤیت ہلال کب ممکن ہوگی۔تو حقیقت یہ ہے کہ رؤیت ہلال کی ولادت کے بعد کچھ محدود وقت گزرنے کے بعد ہی ہوگی بایں طور کہ ہلال کا حجم یا اس کی پیمائش اتنی ہو جائے کہ اس کی رؤیت ممکن ہو سکے جب کہ بہت سے فلکی اور فضائی عناصر اور عوامل کی وجہ سے ابھی تک حساب دان اس پر کوئی معیّن قاعدہ اور زمانی ضابطہ وضع نہیں کر سکے۔

قِران شمس وقمر کے بعد امکان رؤیت پر حساب دانوں کے اقوال

جیسا کہ مذکورہ بالا بحث میں یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ ولادت قمر کے بعد کس حد اور درجہ تک چاند سورج سے دوری اختیار کرے تو اس کی رؤیت کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔اس پر کوئی کلی ضابطہ یا معین وقت نہیں دیا گیا کیونکہ ہر ملک کا محل وقوع اور اس کے مطلع پر نمودار ہونے والا چاند دوسرے بعید ملک اور اس کے مطلع سے مختلف دکھائی دیتا ہے مراکش کے ماہر اسلامیات ڈاکٹر عبدالوہاب نے اپنی معروف کتاب العذب الذلال فی مباحثہ رؤیۃ الہلال: میں حساب دانوں کے اقوال میں اختلاف کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔

	ڈگری	منٹ	گھنٹہ
مصری حلوانی رصدگاہ			
	12	50	20
ابن شاطر	12	50	21

سلطان الغ بیگ	6	24	10
زرقاوی مصری	4	16	7
طنطاوی مصری	7	31	14
روسی رصد گاہ	8	32	14

مندرجہ بالا نقشہ کے مطابق قران شمس وقمر کے بعد رؤیت ہلال کی امکانی حد 4 سے 12 ڈگری اور 16 منٹ سے 50 منٹ تک جاری رہی ہے اس واضح فرق کی وجہ ممالک اور سردی گرمی اور ربیع وخریف کے زمانے کا اختلاف ہی قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالوہاب مراکشی علامہ جوہری طنطاوی رحمہ اللہ کے اس قول کہ 14 گھنٹے اور 7 ڈگری چاند کے سورج سے دور ہونے پر اس کی رؤیت ممکن ہوجاتی ہے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ضابطہ کوئی حتمی اور دائمی نہیں ہے کیونکہ مشاہدے سے بارہا یہ ثابت ہوا ہے کہ چاند کی عمر 14 گھنٹے تھی اور وہ 8 ڈگری سورج سے دور تھا مگر اس کے باوجود اس کی رؤیت نہ ہوسکی آپ اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 29 ربیع الاول 1366ھ کو جمعہ کی شام ربیع الثانی کیلئے ہلال کا مراقبہ کیا گیا قران شمس وقمر اور غروب شمس کے درمیان 16 گھنٹے 20 منٹ کا وقت تھا سورج سے اس کی دوری 8 ڈگری سے بھی اوپر تھی اور وہ مطلع پر 30 منٹ تک موجود رہا مگر پھر بھی اس کی رؤیت نہ ہوسکی یونہی 29 ذوالحجہ 1365ھ جمعہ کی شام کو ذوالحجہ کے چاند کا مراقبہ ہوا چاند کی عمر 17 گھنٹے 48 منٹ تھی سورج سے اس کی دوری 8/57 ڈگری پر تھی اور وہ مطلع پر 32 منٹ تک موجود رہا مگر پھر بھی اس کی رؤیت نہ ہوسکی۔ وعلی کل حال فاعتبار

کون مابین وقت الاجتماع ووقت الرویة ۱۴ الساعة وکون البعدبین النیرین ۸ درجات دائما مما لا ینبغی قبوله لعدم مطابقته للمشاهدة وللوجوه السابقة (۱)

بہرحال یہ کہنا کہ جب قران شمس وقمر کے بعد 14 گھنٹے گزر جائیں اور چاند اور سورج کی دوری ۸ ڈگری تک چلی جائے تو دائمی اور یقینی طور پر رؤیت پائی جاتی ہے ۔ یہ بات قبولیت کے لائق نہیں کیونکہ یہ مشاہدے اور سابقہ وجوہات سے مطابقت نہیں رکھتی۔

مقالہ نگار کی رائے۔

برطانیہ کے محل وقوع اور اس کے مطلع کی عمومی صورتحال کے پیش نظر راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ شرعی اور اسلامی ماہ کا آغاز ثابت کرنے اور عبادات و معاملات میں یقینی حد تک داخل ہونے کیلئے تین صورتیں ہیں رؤیت ' شہادت اور اکمال عدت (تیس دن پورے کرنا) عدم رؤیت بصری کی صورت میں جس سے عموماً برطانوی مسلمان دو چار رہتے ہیں اگر حساب آبزرویٹری سے مدد لیکر عبادات اسلامی کی ادائیگی میں یکجہتی اور شرعی آسانی پیدا کرنی ہے تو پہلی صورت جس میں امکانی حد تک رؤیت بصری بھی آجاتی ہے۔ یہ ہے کہ اجتماع شمس وقمر یعنی ولادت قمر کے بعد جب چاند سورج سے 4 ڈگری تک دوری اختیار کر جائے اور وہ غروب آفتاب کے بعد

---

(۱) العذب الزلال ج ۲ ص ۷۵۷

کم از کم 15 منٹ تک مطلع پر موجود رہے تو نئے اسلامی قمری ماہ کا آغاز کر دیا جائے اور اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو پھر اکمال عدت یعنی 30 دن پورے کر کے قطعی طور پر نئے اسلامی قمری ماہ کا آغاز تسلیم کر لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب دور حاضر کا حساب فلکی آبزرویٹری قطعی اور مسلّم الثبوت حقیقت کے طور پر نظام فلک کی مصدّقہ معلومات فراہم کر رہا ہے اور بنی نوع انسان نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے اپنا نظام حیات بھی منسلک کر رکھا ہے اگر وہ یہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ چاند اپنا دورانیہ مکمل کر چکا ہے اور غروب آفتاب سے پہلے اس کی ولادت ہو چکی ہے اور اندریں حالت برطانیہ یا کسی بھی اسلامی ملک کے مطلع پر اس کی رؤیت بصری یا نظری حسابی کا وقوع و ثبوت بھی پایا جا رہا ہے تو ایک شدید دینی سماجی اور ثقافتی ضرورت کے پیش نظر مسیحی دنیا اور مغربی تہذیب میں رہتے ہوئے اسلامی وقار اور ملی یکجہتی کے اظہار کیلئے اس رات کے بعد آنے والی صبح سے نئے شرعی اور قمری ماہ کا آغاز کر دیا جائے۔

وما توفیقی الّا باللّٰہ العظیم وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی رسولنا الکریم

عبدالرسول منصور الازہری

15 شعبان 2003ء

رؤیت ہلال
اور
اختلاف مطالع

اختلاف مطالع کی بنیاد پر رؤیت ہلال کا کیا حکم ہے اور کیا کسی ایک شہر کی
رؤیت دوسرے شہروں کیلئے معتبر ہوگی؟
نیز شہروں کا اختلاف اور بعد مسافت روزے کے حکم پر اثر انداز ہوں گے یا نہیں۔؟
اختلاف آئمہ پر نظر کرتے ہوئے ترجیحی مسلک کی وضاحت فرمائیں
یہ بھی بتائیں کیا رؤیت ہلال کیلئے برطانیہ میں جدید فلکی اور سائنسی ایجادات سے
استفادہ کیا جاسکتا ہے

والسلام

حافظ حماد ناصر محمود

لندن برطانیہ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزے کے حکم میں شہروں کی دوری کا اثر

وضاحت سوال: یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پہلی کا چاند
غروب آفتاب کے بعد بعض شہروں میں دیکھا جاتا ہے جبکہ بعض شہروں میں وہ دوسری
رات کو دکھائی دیتا ہے اس فرق کی وجہ ان شہروں میں غروب آفتاب کے وقت میں

تفاوت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جب شعبان کی ۲۹ کا چاند کسی شہر میں نظر آگیا اور اس شہر میں بسنے والے مسلمانوں نے روزہ رکھ کر ماہ صیام رمضان کا آغاز کردیا مگر اس رات کسی دوسرے شہر میں چاند نظر نہ آیا تو کیا اس دوسرے شہر والوں پر لازم ہے کہ وہ اس شہر والے مسلمانوں کی اتباع اور اقتداء میں روزہ رکھیں جہاں چاند کی رؤیت ثابت اور مسلّم ہوچکی ہے اور ان کی رؤیت ہلال کو بنیاد مان کر تمام شہروں میں آغاز رمضان کردیا جائے یا ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جب تک ان شہروں کے لوگ خود چاند کا مشاہدہ نہ کرلیں ماہ صیام کا آغاز نہ کریں۔ اس صورت مسئلہ میں آئمہ اسلام کے درمیان خلاف واقع ہوا ہے۔

آئمہ اسلام اور ان کے مذاہب

پہلا مذہب: کسی ایک شہر میں چاند کی رؤیت اس سے دور والے شہر کیلئے معتبر نہ ہوگی اس بنیاد پر اس شہر والوں پر روزہ واجب نہ ہوگا۔ شافعیوں امام زیلعی اور حنفیوں کی کثیر تعداد نے اس رائے پر اعتماد کیا ہے اہل مدینہ نے بھی امام مالک رضی اللہ عنہ سے اس رائے کی روایت کی ہے۔ اور آپ کے اصحاب سے ابن ماجشون اور مغیرہ نے اس روایت کو مختار مانا ہے۔ عکرمہ، قاسم اور اسحاق ابن راہویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔(۱)

---

(۱) المجموع امام نووی ۲۷۴/۶ :فتح الباری ۸۷/۴ :بدایۃ المجتہد ۲۷۸/۱ :احکام القرآن ابن العربی ۸۴/۱ :حاشیہ ابن العابدین ۹۹/۲

دوسرا مذہب:

ایک شہر کی رؤیت ہلال اس شہر اور اس کے علاوہ دوسرے شہر والوں کیلئے بھی معتبر قرار دی جائے گی جب کسی شہر والوں نے ہفتہ کے روز روزہ رکھا پھر انہیں اطلاع ملی کہ دوسرے کسی شہر والوں نے چاند دیکھ کر جمعہ کے دن روزہ رکھا ہے تو ان پر ایک روزہ قضا کرنا واجب ہوگا۔ ظاہر الروایہ کے مطابق یہ حنفیوں کا مذہب ہے حنبلیوں نے بھی اسے پسند کیا ہے ابن قاسم اور مصریوں نے امام مالک رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے اور ابن المنذر نے امام المزنی سے اس رائے کو نقل کیا ہے (۱)

ملاحظہ:

بعض اہل علم نے اس خلاف کو صرف اس صورت میں محصور رکھا ہے کہ جب ان دونوں شہروں کے درمیان بہت زیادہ مسافت اور شدید دوری نہ ہو تو ایسی صورت میں ایک شہر کی رؤیت ہلال دوسرے شہر کیلئے بھی معتبر اور قابل حجت ہوگی۔ مگر جب دونوں کے درمیان دوری اور مسافت میں شدت موجود ہو جیسا کہ اندلس اور حجاز کے مابین بعد مسافت پائی جاتی ہے۔ تو اندریں حالت ہر شہر کی اپنی رؤیت کو مستقل تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ پر اہل علم کا اجماع ہو چکا ہے جیسے امام قرطبی نے احکام القرآن میں حضرت ابو عمر سے اور امام ابن حجر نے فتح الباری میں امام ابن عبد البر سے نقل کیا

---

(۱) حاشیہ ابن عابدین ۹۹/۲ :بدایۃ المجتہد ۲۷۸/۱ :تفسیر القرطبی ۲۹۵/۲

ہے اور علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں بھی یہی اجماع نقل کیا ہے البتہ امام نووی شافعی نے المجموع میں یہ بات نقل کی ہے کہ کچھ علماء کا یہ مذہب ہے کہ کسی ایک جگہ کی رؤیت ہلال ثابت ہو جانے پر تمام روئے زمین میں رہنے والے مسلمانوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اس مذہب پر اجماع کا منعقد ہونا ناممکن ہے۔(۱)

اس نزاع اور خلاف کے محل سے نکلنے کیلئے دوسری صورت یہ ہے کہ جب ملت اسلامیہ کے قائد اعظم اور امیر المومنین کے حضور رؤیت ہلال شرعی بنیاد پر ثابت ہو جائے اور وہ اپنا فرمان تمام لوگوں کیلئے جاری کر دے تو اختلاف اماکن اور تباعد بلدان کے باوجود تمام لوگوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جائے گا۔ کیونکہ امیر المؤمنین کیلئے اس کے زیر سایہ تمام شہر ایک ہی شہر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس کا حکم تمام شہروں میں یکساں طور پر جاری اور نافذ العمل قرار دیا جاتا ہے۔(۲)

شہروں کی دوری پر ہر شہر کی رؤیت ہلال کے الگ ہونے پر دلائل

جو علماء شہروں کی مسافت اور دوری کے پیش نظر ہر شہر کی رؤیت ہلال کو مستقل قرار دیتے ہیں وہ اپنے موقف پر سنت قیاس اور عقل سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

(۱) المجموع امام نووی ۲۷۴/۶ (۲) فتح الباری ۸۷/۴ : تفسیر القرطبی ۲۹۶/۲

حضرت کریب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہیں حضرت امّ فضل بنت حارث نے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جب میں نے وہاں پہنچ کر ان کا کام مکمل کر دیا تو میں ابھی شام میں ہی تھا کہ ماہ رمضان کا چاند نظر آ گیا میرے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا جب میں اس مہینے کے آخر میں مدینہ منورہ پہنچا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے چاند کب دیکھا تھا میں نے کہا ہم نے تو جمعہ کی رات کو چاند دیکھا تھا آپ نے کہا کیا تو نے بھی دیکھا تھا میں نے عرض کیا دوسرے لوگوں کے علاوہ میں نے بھی دیکھا اور حضرت معاویہ سمیت وہاں کے تمام لوگوں نے روزہ رکھا تھا۔ آپ نے کہا مگر ہم نے تو چاند ہفتہ کی رات کو دیکھا تھا اس لیے ہم تو روزہ رکھیں گے یا تو چاند دیکھ لیں گے ورنہ تیس دن پورے کریں گے میں نے کہا کیا حضرت معاویہ کی رؤیت اور ان کا روزہ رکھنا کافی ووافی نہ ہوگا آپ نے فرمایا نہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح حکم فرمایا ہے(۱)

اس حدیث میں محل استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے هكذا امرنا رسول الله ﷺ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح حکم فرمایا ہے۔

اس قول میں اس امر کی صراحت ہے کہ یہ حکم خود رسول اللہ ﷺ نے صادر فرمایا ہے جو اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ شام و حجاز کی طرح جب شہر ایک دوسرے سے دوری اور لمبی مسافت پر واقع ہوں تو ہر شہر کی اپنی رؤیت ہلال ہوگی وہ اس مسئلہ میں کسی دوسرے شہر کی رؤیت پر عمل نہ کرے گا۔

---

(۱) مسلم، ترمذی، ابوداود، النسائی، محاضرات فی الفقہ المقارن ڈاکٹر البوطی الشامی

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ لاتصوموا حتی تروا الھلال ولاتفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ (۱) جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو اور جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ افطار نہ کرو پس اگر وہ بادلوں میں چھپ جائے تو اس کا اندازہ کرلو۔ اس حدیث مبارک میں محل استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کے روزے اور اس کے افطار کرنے کو ان کی رؤیت ہلال کے ساتھ وابستہ کردیا اس امر کا تقاضا یہ ہے کہ روزہ صرف اس پر لازم ہوگا جو خود چاند کو دیکھے گا۔ البتہ ایک شہر کے رہنے والے اس تقاضے سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ سنت نبویہ نے اس بات کی وضاحت فرمادی ہے کہ امام وحاکم کے سامنے ایک عادل مسلمان کی رؤیت ہلال کی شہادت اس پورے شہر کے مسلمانوں کیلئے معتبر تصور ہوگی۔

اس شہر کی مضافاتی بستیاں اور قرب و جوار کے شہر بھی اس کے تابع سمجھے جائیں گے۔ البتہ مسافت بعیدہ پر واقع شہر اس حدیث کے مقتضیٰ کے مطابق اس حکم سے خارج رہیں گے جب تک ان شہروں میں چاند کی رؤیت ثابت نہ ہوگی۔ ان پر روزہ رکھنا فرض نہ ہوگا۔ (۲)

امام تاج الدین السبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب العلم المنشور فی اثبات الشھور میں سنت نبویہ سے ہی یہ دلیل نکالی ہے۔ شہر میں حجاز سے پہلے ایک روز رؤیت

---

(۱) بخاری، مسلم (۲) الرملی علی المنہاج نووی ۱۵۳/۳ : سبل السلام ۲۵۰/۲

ہلال ہو جائے تو اہل حجاز ان کی رؤیت کے پابند نہ ہوں گے بلکہ وہ اپنی رؤیت کے مطابق ہی حج ادا کریں گے۔(۱)

عقلی استدلال:

اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم ایک معین وقت اور مخصوص زمانے کیساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ جس کی حد بندی چاند کی افلاک میں گردش اور اس کے دورانیے سے ہی کی جاسکتی ہے۔ زمین پر شہروں کے اختلاف اور ان کی باہمی بعد مسافت کے اختلاف کے سبب اَزمنہ اور اوقات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسلئے شہروں کے اختلاف کے باعث روزے کے حکم کا اختلاف بھی ایک یقینی امر ہے

شہروں کی دوری سے روزے کے حکم پر اثر نہیں پڑتا۔

پہلی دلیل:

امام مسلم اور دیگر محدثین نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاقدروا له ثلاثین**

رؤیت ہلال پر ہی روزے اور اسکے افطار کا مدار ہے۔ اگر وہ بادلوں میں چھپ جائے۔ تو تم تیس دن پورے کرلو۔

---

(۱) الرملی علی المنہاج امام نووی ۱۵۳/۳ : حاشیہ الترمسی شرح مقدمہ حضرمیہ ۱۶۶/۴، حاشیہ در مختار ۹۹/۲

اس حدیث میں محل استدلال یہ ہے کہ اس میں عام مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے۔
اور روزے اور اس کے افطار کا معاملہ مطلق رؤیت پر معلّق کر دیا گیا کسی ایک شہر کی رؤیت کی تخصیص نہیں کی گئی یعنی کسی بھی جماعت یا کسی بھی فرد کی رؤیت کے ثابت ہو جانے پر اسکی شہادت قبول کر لی جائے گی اور تمام شہروں میں اس پر عمل کرنا لازم ہو گا۔

قیاسی دلیل: جس شہر میں رؤیت ہلال ثابت ہو چکی ہے اسکے گرد و نواح کی آبادیوں اور قریبی شہروں کی طرح دور مسافت پر واقع شہروں کو بھی ان پر قیاس کرنا چاہیے کیونکہ قریب و بعید شہروں میں تفریق کرنے کیلئے کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔
کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یا کسی بھی خلیفہ راشد سے یہ بات منقول نہیں ہوئی کہ انہوں نے چاند پر بحث کرتے وقت اپنے قاصدوں کو مکتوب دیکر دوسرے شہروں میں روانہ کیا ہو کہ وہ بتائیں کہ آیا ان کے یہاں چاند کی رؤیت ہوئی ہے یا نہیں اگر دوسرے شہروں میں ثابت ہونے والی رؤیت ہلال سے ان پر روزہ لازم ہوتا تو یہ حضرات ان شہروں سے ضروری طور پر خط و کتابت کرتے اسی طرح اس کے برعکس اگر خلفاء راشدین کے شہروں میں رؤیت ہلال ہوتی تو یہ حضرات ان بلاد اسلامیہ بعیدہ کی جانب بھی کوئی مکتوب یا قاصد روانہ نہ فرماتے تھے اس بنا پر اگر ان کے یہاں ہونے والی رؤیت ان بلاد بعیدہ کیلئے کافی ہوتی تو ان کیلئے ایسا انتظام کرنا واجب قرار پاتا۔

قیاس:

جو علماء اسلام شہروں کی مسافت بعیدہ کو روزے پر اثر انداز مانتے ہیں وہ ہلال کو شمس وقمر پر قیاس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شہروں کی باہمی بعد و مسافت کا اثر نمازوں کے اوقات کے اختلاف سے نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اور اس اختلاف کی بنیاد ان شہروں میں سورج کی رؤیت کا تقدم وتاخر اور شروق وغروب ہی قرار دیا جاتا ہے۔ یہی صورت اختلاف فجر کے وقت میں بھی موجود ہے تو جو سبب یہاں موثر ہو رہا ہے بعینہ وہی سبب ایک شہر سے دوسرے شہر میں ظہور ہلال کے اختلاف میں بھی نظر آرہا ہے تو جو سبب اختلاف شمس وقمر سے حکم کو متاثر اور متغیر کر رہا ہے وہی سبب ظہور ہلال کے اختلاف پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے اس سلسلے میں یہ حضرات روزے والے باب میں اختلاف ہلال کو حج پر بھی قیاس کرتے ہیں کہ جن علماء کرام کے نزدیک مختلف شہروں کی دوری مسافت کا کوئی اعتبار نہیں اور وہ ایک شہر کی رؤیت ہلال کو دوسرے شہروں کیلئے کافی ومعتبر مان لیتے ہیں۔وہ بھی حج کے معاملے میں اختلاف ہلال کو موثر تسلیم کرتے ہیں علامہ ابن عابدین شامی حاشیہ درالمختار میں لکھتے کہ کتاب الحج میں ان علماء کی کلام سے سمجھا جاتا ہے۔ کہ حج میں ان کے نزدیک بھی اختلاف مطالع کا اعتبار رکھا گیا ہے

مناقشہ۔

جو حضرات شہروں کے اختلاف اور بعد مسافت کو روزے کے حکم پر اثر

انداز ہونے کے قائل نہیں اور وہ اس موقف پر صوموا لرؤیته سے استدلال کرتے ہیں کہ رؤیت ہلال کا یہ حکم مطلق ہے کسی بھی فرد یا جماعت سے رؤیت کے ثابت ہونے پر قریب و بعید شہروں میں اس پر عمل پیرا ہونا ضروری قرار دیا جائے گا۔ تو ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ ایک دوسری روایت جو بخاری و مسلم میں موجود ہے اسکی تفسیر کر رہی ہے کہ یہ حکم مطلق نہیں بلکہ مخاطبین میں سے ہر مخاطب کی رؤیت کے ساتھ خاص ہے۔ اور وہ روایت یہ ہے لاتصوموا حتی تروا الهلال اگر سنت ثابتہ نے شہادت صحیحہ کا اعتبار کر کے اسے تمام لوگوں کی رؤیت کے مرتبہ پر نہ اتارا ہوتا تو حدیث کے ظاہر کے مطابق ہم ہر شخص پر اسکی اپنی رؤیت پر ہی روزے کو واجب قرار دیتے مگر اس حدیث کے عموم سے بعض افراد کی شہادت کو خاص کر لیا گیا اور دوری پر واقع شہروں کی نسبت سے یہ حدیث اپنے عموم پر ہی قائم رہی۔

ان حضرات کی قیاسی دلیل کی تردیدیوں کی جارہی ہے کہ رؤیت والے شہر اور غیر رؤیت والے شہر میں بعد اور دوری کی شدت کا تقاضا ہے کہ ہر شہر کا حکم الگ الگ ہو کیونکہ ان دونوں شہروں کے درمیان کوئی جامع علت موجود نہیں ہے۔

فریق اول جو اختلاف بلاد اور ان کے درمیان بعد مسافت کے باعث روزے کے حکم میں مختلف ہونے کا قائل ہے۔ اس کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ حدیث کریب کے سلسلے میں ہماری تحقیق کے مطابق صورتحال کچھ یوں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے اس لئے نہیں چھوڑا کہ ملک شام کا مطلع حجاز مقدس کے مطلع سے مختلف تھا اور ان دونوں شہروں میں شدید طرح کا بعد مسافت تھا۔ جس کی بنیاد پر ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کیلئے نا قابل اعتبار تھی بلکہ اسکے ترک کرنے اور

اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ اس کا خبر واحد ہونا تھا۔ جو ایسی شہادت میں ناکافی تھا۔ اگر یہی خبر واحد مزید راویوں کی روایت سے قوی ہو جاتی تو آپ اس پر عمل کرتے اور اہل شام کی رؤیت کا اعتبار کر لیتے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل کے جواب میں یہ بات بھی کہی گئی ہے

کہ حتی تروہ سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد رؤیت ہلال کی شہادت کا پایا جانا ہے کہ جب رؤیت کی شہادت پائی جائے تو پھر تمام لوگوں کے لئے روزے کا وجوب و لزوم ہو جائے گا۔ شہروں کی مسافت اور ان کے اختلاف کا اعتبار کرنا ایسا قول ہے جس پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں پائی گئی۔

فریق اول کی قیاسی دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ روزے کے حکم کو نماز کے اوقات کے اختلاف پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات کے اختلاف میں تو سنت اور اجماع امت نے شمس وقمر کے اختلاف سے اثر اندازی کا اعتبار کیا ہے جبکہ روزے کے حکم میں سنت واجماع سے ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جس سے روزے کو اوقات نماز پر قیاس کیا جا سکے۔(۱)

شافعیوں کی طرف سے حدیث کریب پر وارد ہونے والے اعتراض کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سے خبر واحد سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ کا یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ حضرت کریب کی ابن عباس کے ساتھ یہ بات چیت ان کی طرف سے کوئی شہادت نہ تھی۔ کہ جسے آپ نے ایک خبر واحد کے طور پر مسترد کر دیا ہو بلکہ یہ تو ایک

---

(۱) حاشیہ ابن عابدین ۹۹/۲

ایسے حکم کے متعلق خبر تھی جو شہادت کے ساتھ ثابت ہو کر لوگوں میں مشہور ہو چکا تھا۔

بلکہ تواتر کی حد تک پہنچ گیا تھا ایسے حکم کے بارے تو تمام ائمہ اسلام کے نزدیک خبر واحد قبول کرلی جاتی ہے۔(۱)

ترجیح:

اس مسئلہ پر دلائل اور پھر ان پر مناقشہ عرض کرنے کے بعد اب ہم عظیم محقق علامہ الصنعانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق و ترجیح کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں آپ فرماتے ہیں۔ **فی هذه المسئلة أقوال ليس على احدهما دليل ناقص فالاقرب لزوم اهل بلد الرؤية وما يتصل بها من الجهات التی علی سمتها**

اس مسئلہ پر کئی اقوال پائے جاتے ہیں۔مگر کسی ایک پر بھی کوئی قوی اور طاقت ور دلیل موجود نہیں اور اقرب الی الصواب یہی ہے کہ جس شہر میں رؤیت ہلال ہوئی اور اس سمت پر جتنے شہر اور گرد و نواح کی بستیاں موجود ہیں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں پر روزہ اور اسکے افطار کا حکم لازم ہو جاتا۔علامہ محمد سعید البوطی شامی فرماتے ہیں کہ جس غیر اسلامی ملک میں مسلمان بھی اقلیت کے طور پر رہائش پذیر ہوں وہاں شوافع اور ان کے ساتھ دیگر ائمہ اسلام کی ترجیحی رائے اور مختار مذہب یہ ہے کہ جب وہ غیر اسلامی ملک اس اسلامی ملک جس میں رؤیت ہلال ثابت ہوئی ہے سے شدید دوری پر واقع ہو تو ان کے لئے اسی غیر اسلامی ملک اور شہر میں پائی جانے والی رؤیت کو ہی معتبر مانا جائے گا۔(۲)

---

(۱) بدایۃ المجتہد ۲۷۹/۱: محاضرات فی الفقہ المقارن ڈاکٹر بوطی شامی ص ۲۲

(۲) محاضرات فی الفقہ المقارن ڈاکٹر بوطی شامی

شہروں کی دوری اور بعد مسافت کا ضابطہ:

اہل علم سے جو حضرات شہروں کی دوری اور بعد مسافت سے روزے کے حکم کو مختلف مانتے ہیں وہ بعد اور دوری کا ضابطہ اور اسکی حد بندی کے سلسلے میں بھی تین قول رکھتے ہیں۔

پہلا قول جو باقی دو اقوال سے زیادہ صحیح قرار دیا جاتا ہے عراقی اور ان کے علاوہ کچھ علماء کا ہے کہ وہ بعد اور دوری جو روزے کے حکم پر اثر انداز ہوتی ہے وہ ہے جس سے چاند کے مطالع مختلف ہو جاتے ہیں۔ اور جو بعد اور دوری مطالع کے اختلاف میں مؤثر نہ ہوگی وہ غیر معتبر مانی جاتی ہے۔

اس مسئلہ کی تحقیق اور تحدید کیلئے اس فن کے ماہرین سے رجوع کیا جاسکتا ہے اور جدید علمی اور تحقیقی ذرائع پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اقلیم و مملکت کے اتحاد و اختلاف کا اعتبار ہوگا۔ اگر اقلیم و مملکت ایک ہے تو دونوں شہر دوری مسافت کے باوجود قریب تصور ہوں گے۔ اور اگر اقلیم و مملکت مختلف ہے تو دونوں شہر بعید تسلیم کیے جائیں گے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جتنی مسافت پر نماز قصر کی جاتی ہے اس کا اعتبار ہوگا اگر مسافت قصر سے کم دوری ہو تو وہ دونوں شہر متقارب کہلائیں گے۔

مگر یہ دونوں اقوال ضعیف ہیں علماء نے ان پر اعتماد و استناد نہیں کیا۔(۱)

---

(۱) المجموع امام نووی ۲۷۳/۶

جو حضرات بلاد کے تباعد کو روزے کے حکم میں مؤثر مانتے ہیں وہ بعد مسافت کے سلسلے میں اختلاف مطالع کو علت قرار دیتے ہیں جبکہ اختلاف مطالع کا مسافت قصر اور اختلاف اقلیم سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا کیونکہ مطالع کا اختلاف دو شہروں کے درمیان جنوباً وشمالاً طول واحد کی حدود میں عدم واشتراک سے پایا جاتا ہے اور ان کا اتحاد طول البلدین کی تساوی اور باہم برابری سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دونوں شہروں کے طول میں تساوی ہو تو ان میں کسی بھی ایک شہر میں رؤیت ہلال دوسرے شہر میں رؤیت ہلال کو لازم اور واجب ہوگی۔ خواہ ان دو شہروں کے درمیان کتنی بھی دوری اور مسافت پائی جائے اور جب ان دونوں شہر کا طول مختلف ہوگا تو ان کے درمیان تساوی ناممکن ہو جائے گی۔ لیکن اگر مغربی شہر میں رؤیت ہلال ہوگئی تو مشرقی شہر میں بھی رؤیت ہلال یقینی طور پر ثابت ہو جائے گی۔ مگر اس کا عکس ہو جائے یہ ناممکن ہے اس سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ مسافت کا اس اختلاف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جدید فلکی اور سائنسی آلات سے استفادہ واستعانت کرنا

انسانی زندگی میں صحیح توازن امن ووقار اور اسمیں دنیاوی واخروی سعادت پیدا کرنے کیلئے شریعت محمدیہ نے جو منہاج اور رہنما اصول وضع کئے ہیں وہ ابدی آفاقی اور غیر متبدل حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی بھی عقلی وفکری پیش رفت ان اصولوں میں اضافہ یا کوئی نیا اصول ایجاد نہیں کرسکتی البتہ پہلے سے موجود اور مسلم الثبوت کسی ابدی حقیقت کا انکشاف ہی کرسکتی ہے اگر عصر حاضر میں مائیکروسکوپ اور خوردبین کے استعمال سے پانی کے ایک قطرہ میں طرح طرح کی اشیاء اور ان میں حیات کے مظاہر

دیکھے جارہے ہیں۔ جو اس آلہ اور ایجاد سے قبل نظر وفکر پر محجوب ومستور تھے۔ تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس جدید انکشاف پر یہ مخلوقات وجود میں آئی ہیں قطرہ آب میں یہ مخلوقات اپنے وجود حیات کے ساتھ روز اول سے ثابت وموجود تھیں۔ البتہ اس عصری ایجاد کے ذریعہ سے ان کا انسانی عقل وشعور پر انکشاف وظہور اب ہورہا ہے۔ جدید سائنسی مطالعہ عقل انسانی کو علمی افق کی کتنی ہی بلندی تک لے جائے وہ متوازی شریعت ہوسکتا ہے اور نہ ہی اسے ابدی اور آسمانی شریعت پر بالادستی قائم ہوسکتی ہے۔ علوم وفنون کی تمام تر بلندیاں منہاج الٰہی اور شریعت محمدی کے غیر متبدّل اور آفاقی اصولوں کو شکست وریخت سے ہمکنار نہیں کرسکتیں۔

خلاصۂ کلام

مندرجہ بالا جواب جو اربعہ مذاہب کی فقہ مقارن کے مطالعہ اور تناظر میں پیش کیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر ملک اور دور دور واقع ہونے والے شہروں کا مطلع اور ان میں شمس وقمر کے طلوع وغروب کا اپنا اپنا نظام ہے جس سے اس ملک اور شہر کے روزے اور اسکے افطار کا لزوم وابستہ دکھائی دیتا ہے ایک شہر کی رؤیت دوسرے بعید شہر کیلئے مؤثر اور مستلزم نہ ہوگی برطانیہ ایک مستقل ملک ہونے کے اعتبار سے اپنا مطلع رکھتا ہے جس پر ہلال کی رؤیت بصری کا دارومدار ہے لیکن اگر بادل وغیرہ کے عارضہ سے رؤیت بصری ناممکن ہو تو ایک شدید ضرورت کے تحت عقلی اور شرعی طور پر برطانیہ کی رصدگاہ ابز رویٹری سے استفادہ کرتے ہوئے کہ اگر بادل وغیرہ کا حجاب نہ ہوتو چاند کی رؤیت بصری ممکن ہے۔ اور وہ اس پوزیشن میں موجود ہے کہ اگر عارضی موانع

نہ ہوں تو وہ رویت کے قابل ہے ایسی حالت کی مصدقہ اطلاع ملنے پر نیا اسلامی مہینہ شروع کیا جاسکتا ہے۔ دین اسلام کی فطری یُسر وآسانی اور فقہ اسلامی کی روح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ برطانیہ میں عدم رویت ہلال کی صورت میں ابزرویٹری کی مذکورہ رپورٹ پر عمل کیا جائے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

یکم اپریل 2003ء

اسلامی جہاد کی حقیقت
و
اعلان جہاد کا ذمہ دار کون؟

شریعت اسلامیہ کی روشنی میں جہاد کی حقیقت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمائیں کہ جہاد کی اہم ترین قسم کیا ہے۔ نیز جہاد قتالی کے وجوب کا حقیقی سبب کیا تھا؟ یہ بھی بتائیں کہ جہاد قتالی کا اعلان امیر المسلمین کی ذمہ داری ہے یا جو چاہے اعلان جہاد کرتا پھرے جیسا کہ دور حاضر میں معمول بنتا جا رہا ہے۔

والسلام

قاری محمد حفیظ

خطیب جامع مسجد صدیقیہ نزد چونگی نمبر 6

جی ٹی روڈ اوکاڑہ

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہاد اور اسلام

اکثر لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں جہاد جو ایک اہم رکن کی حیثیت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد ہی ظاہر اور نافذ العمل ہوا تھا اس سے قبل جہاد کا کوئی حکم اور اسکی کوئی عملی صورت دکھائی نہیں دیتی جبکہ حقیقت حال اس کے برعکس نظر آتی ہے مدنی دور کی طرح مکی دور میں بھی رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ جہاد سے معمور و بھرپور دکھائی دیتی ہے آیئے سورہ فرقان جو کہ ایک مکی سورہ ہے اس کی آیت نمبر ۵۲ کی تلاوت کرتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے فلا تطع الکافرین و جاھدھم بہ جھادًا

کبیرًا "اور کافروں کا کہانہ مان اور اس قرآن سے ان پر جہاد کر بڑا جہاد"

اور اس کے ساتھ سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۱۰ بھی ملاحظہ ہو ثم ان ربک للذین ھاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاھدوا و صبروا ان ربک من بعدھا لغفور رحیم

پھر بیشک تمہارا رب ان کیلئے جنہوں نے اپنے گھر چھوڑے بعد اس کے کہ ستائے گئے پھر انہوں نے جہاد کیا اور صابر رہے بے شک تمہارا رب اس کے بعد ضرور بخشنے والا ہے مہربان۔

جمہور مفسرین جن میں ابن زبیر' حسن بصری' عکرمہ' عطا' جابر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھم بھی شامل ہیں کا قول ہے کہ آیت نمبر ۹۷/۹۶/۹۵ کے علاوہ یہ ساری سورہ مکی ہے مذکورہ بالا دونوں آیات کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مکی دور میں بھی جہاد جاری وساری رہا اکثر لوگوں کے ذہنوں میں اس بات کے راسخ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جہاد کو اس کے قتالی معنی یعنی جہاد بالسیف میں ہی بند کر رکھا ہے لاریب کہ مشرکین کے ساتھ قتال کرنا ہجرت مکہ اور رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ میں قیام کے بعد ہی مشروع اور نافذ العمل ہوا تھا مگر اس سے یہ گمان کر لینا کہ اسلام میں جہاد کا حکم ہجرت مکہ کے بعد ہی وارد ہوا ہے بہت بڑی غلط فہمی ہے چنانچہ جہاد کے اس تصور ومفہوم نے جہاد کی بہت ہی اہم انواع واقسام کو ذہنوں اور نظروں سے اوجھل کر دیا کیونکہ جہاد کی سب سے اہم نوع وہی ہے جو مکہ مکرمہ میں دعوت اسلام کی ابتدائسے ہی وجود میں آچکی تھی۔ بلکہ بعد میں احوال وکوائف حیات میں اختلاف سے پیدا ہونے والی جہاد کی جملہ فروعات کی اساس وبنیاد جہاد کی یہی اعلیٰ ترین نوع تھی۔

جہاد کی اہم ترین قسم

شریعت محمدیہ میں جہاد کی اعلیٰ ترین نوع وہی ہے جو طلوع اسلام سے ہی نافذ اور صادر کردی گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام مشرکین و کفار کے روبرو ہوکر انہیں دعوت اسلام پیش کریں اور انہیں اپنے آباء و اجداد کی رسومات باطلہ کی تقلید سے منع کرنے میں اپنی توانائی کو صرف کریں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی مکی زندگی میں جہاد کی یہی وہ اہم ترین قسم تھی جس پر عملدر آمد سے تشدد اور ظلم و ستم کی کوئی حد نہ رہی مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص صحابہ ایمان کامل اور نور بصیرت سے معمور رہ کر ہر قسم کے خطرات و مظالم کا مقابلہ کرتے رہے انہی حالات میں اسی قسم کو اللہ تعالیٰ نے صراحۃً جہاد کا نام دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ”اور کافروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان پر جہاد کر بڑا جہاد۔“ اس ارشاد ربّانی کا صاف مطلب یہی ہے کہ آپ ان مشرکوں کے ساتھ قرآن مجید اور اسکے دلائل قاہرہ کے ساتھ جہاد کبیر کرو جہاد کی اسی قسم کو اس کا اصلی جوہر قرار دیا گیا ہے او اس کا جہاد قتالی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاد کی یہ حقیقت کبرٰی اپنے تمام تر ظہور کے باوجود اکثر لوگوں کے أذہان سے محجوب دمستور دکھائی دیتی ہے۔ جب بھی ان کے سامنے جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو وہ اس سے جہاد قتالی ہی مراد لیتے ہیں ان کے قلب و نظر میں اسکی اساسی اور بنیادی قسم کا گزر تک نہیں ہوتا یونہی جب ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر (۱)

---

(۱) سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ

''افضل جہاد یہ ہے کہ کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔'' آتی ہے تو وہ اس سے مراد بھی جہاد قتالی ہی لیتے ہیں ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے۔ کہ حدیث مبارک میں وارد ہونے والے کلمہ حق سے زجر و توبیخ کا معنی سمجھا جا رہا ہے جو قتال و مقابلہ پر ہی جا پہنچتا ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں کلمہ حق کی اس معنی پر دلالت کا کوئی قرینہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہ حدیث مبارک اپنے معنی و مفہوم میں کسی بھی سلطان و حاکم کے زجر اور ظلم و ستم کے سامنے ملائم و نرم کلمہ پر استقامت اور اس کے اظہار کی اہمیت کو واضح کر رہی ہے۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد جب سیّد عالم ﷺ مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے تو یہ تمام تر جہادی اصول اپنی اصلی حالت پر شروع اور قائم رہے آپ اور آپ کے صحابہ کرام اسی اساسی جہاد کے مطابق اسلام کی نشر و اشاعت میں منہمک و مصروف رہے مگر استقرار مدینہ کے بعد کچھ نئے حالات کے پیدا ہونے پر اس میدان میں مسلمانوں کی کچھ اضافی ذمہ داریاں رونما ہوئیں جن سے یہ دو اہم امور سامنے آتے ہیں۔

1: مدینہ منورہ میں پہلا اسلامی معاشرہ جو ایک تحریری دستور کے تحت معرض وجود میں آیا جس میں مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے ساتھ وہ یہودی بھی شریک تھے۔ جنہوں نے وہاں امن و سلامتی سے رہنے کا اقرار کیا۔ اس میثاق مدینہ کی تفصیلات سیرت ابن اسحاق اور مسند امام احمد حنبل ۱۰/۲۱ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اس اسلامی معاشرے اور نظام کی قیادت و امارت روز اول سے ہی رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری قرار پائی آپ نبی مرسل ہونے کے ساتھ اس اسلامی حکومت کے امام اور امیر بھی تسلیم

کر لئے گئے تھے۔ ہجرت کے بعد یہ وہ پہلی تبدیلی تھی جو مسلمانوں کی زندگی میں رونما ہوئی

2: سب سے پہلے دارالاسلام کے قیام کا عمل میں آنا سرزمین مدینہ منورہ پر پہلی اسلامی حکومت اپنے تمام تر اساسی اصولوں کے مطابق قائم و نافذ کردی گئی اور انسانی زندگی کو منظم خطوط پر رواں رکھنے کیلئے ایک الٰہی نظام و قانون کو متحرک کردیا گیا جب مدینہ منورہ میں قیام کے بعد آپ ﷺ کو اپنے صحابہ سمیت ان نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا تو مندرجہ ذیل اقدامات آپ کیلئے ناگزیر ہو گئے۔

۱: اس نوزائیدہ اسلامی حکومت اور اسکی سرزمین کی حدوں کی حفاظت اور حمایت کرنا تا کہ کوئی ظالم و باغی طاقت اسے نقصان نہ پہنچا سکے۔

۲: اسلامی نظام کو نقصان پہنچانے یا دارالاسلام کے کسی حصے پر قبضہ کرنے والے کے ساتھ جنگ و قتال کرنا

۳: وہ جہادی دعوت جسے رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ سمیت امن و صلح سے پیش کرتے تھے۔ اب اس کے منکر کے ساتھ جنگ و قتال کرنا۔ ہجرت کے بعد اب اس دعوت کے منکر و مخالف سے قتال کرنا اس لئے ضروری ہوا کہ اب اس دعوت کو ایک باضابطہ حکومت اور اسکے رئیس و امیر کی حمایت ہو چکی تھی۔ جب کہ یہی دعوت پہلے ان افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کے پاس نہ تو کوئی منظم حکومت تھی نہ ہی وہ کسی زمین کے مالک تھے اور نہ ہی کوئی ذمہ دار سیاسی رہنما ان پر نگران تھا۔ اس سے قبل خود رسول اللہ ﷺ کی شخصیت بھی ایک مبلغ اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے ہی مصروف عمل تھی۔

۴: جزیرہ عرب میں رہائش پذیر جب بت پرستی پر اصرار کریں تو حقیقت اسلام

کے واضح ہو جانے پر ان سے قتال کرنا چنانچہ قتال کی یہی وہ قسم ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اس قول مبارک میں مراد لی گئی ہے۔

عن عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ أمرت أن أقاتل النّاس حتّٰی یشھدوا ان لآالہ الّا اللّٰہ وانّ محمدًا رسول اللّٰہ ویقیموا الصّلوۃ ویؤتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذالک عصموا منّی دمائھم وأموالھم الّا بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ تعالیٰ. (۱)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں جب وہ یہ کام کرلیں تو میری جانب اسے ان کی جانیں اور ان کے اموال محفوظ ہو جائیں گے۔ مگر اسلام کا حق ثابت رہے گا۔ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہوگا۔''

جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے انہیں آیہ جزیہ اور احادیث جزیہ نے اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ بہر حال جب دین اپنے عقائد واحکام کے اعتبار سے حد کمال کو پہنچ گیا تو جہاد اپنی انواع واطوار کے ساتھ دین کا ایک اصل قرار پا کر قیامت تک کے لئے دائم وقائم کر دیا گیا۔

انسان کی آزادی اور احکام شریعت کی تکلیف:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی حریت وآزادی کے ساتھ اسے

---

(۱) صحیح مسلم، صحیح بخاری

احکام شریعت کا مکلّف بھی قرار دیا گیا ہے۔ذیل میں اسی عنوان پر گفتگو کی جارہی ہے

انسان اس اعتبار سے کہ اس کا تعلق اپنے خالق اللہ سبحانہ سے ہے وہ اس کا عبد مملوک اور اسکی حقیقی اور کامل ملکیت ہے اس بنیاد پر وہ اس امر کا مکلّف ٹھہرا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی طرف سے جاری ہونے والے فرمان کو پوری توجہ اور غور سے سنے اس کی جانب سے آنے والی ہر خبر کی تصدیق کرے اور اسکے ہر امر و نہی پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل بھی کرے اس اساس پر تو انسان کسی بھی ایسی آزادی کا مالک نہیں جس سے وہ متمتع اور نفع حاصل کر سکے کیونکہ وہ اول و آخر ایک عبد مملوک اور بندہ محکوم ہے۔حریت اور عبدیت' آزادی اور غلامی ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں جو ایک وجود میں جمع نہیں ہو سکتیں پھر انسان کسی بھی ایسی آزادی کا مالک نہیں جس سے وہ نفع حاصل کر سکے اس جملے کا معنی یہ ہے کہ انسان کو اس طور پر بے کار پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ کارزار حیات میں جیسے چاہے بھٹکتا اور قلا بازیاں کھاتا پھرے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کچھ ذمہ داریوں کا مکلّف بنا کر پیدا کیا ہے اگر وہ انہیں اسکی مرضی اور ہدایت کے مطابق پورا کرے گا تو اللہ جل شانہ اسے اس مرتبہ و مقام تک بلند کر دے گا جہاں اسکے ملائکہ مقرّبین بھی نہ پہنچ سکیں گے اور وہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں سے اعراض وانحراف کرے گا۔تو اللہ جل مجدہٗ اسے عذاب ورسوائی میں ڈال کر اسفل السافلین تک لے جائے گا۔

اس مقام پر عدم آزادی کا یہ مطلب لینا کہ انسان داخلی طور پر عاجز اور ذاتی اعتبار سے کسی قسم کا تصرف کرنے سے درماندہ اور بے بس ہے کسی طرح بھی درست نہیں بلکہ اس کا معنی و مراد وہ حکم تکلیفی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لازم کیا گیا

ہے جس پر آخرت میں سزا و جزا کو وابستہ کر دیا گیا ہے بایں معنی انسان کسی آزادی کا مالک نہیں ہے چنانچہ تمام کتب سماوی کے نزول سے اسی عہد و ذمہ داری کی یاد دہانی کرائی جاتی رہی اور آخری کتاب قرآن مجید جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی اس میں اللہ جل شانہ نے تمام انسانوں سے اسی سلسلہ میں خطاب فرمایا آئندہ سطور میں چند آیات قرآنی پیش کی جارہی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے اس حکم تکلیفی کے متعلق خطاب فرمارہا ہے۔

1: یاایّھاالانسان انک کادح الی ربک کدحًا فملقیه o فامّا من اوتی کتٰبه بیمینه o فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا o وینقلب الٰی اهله مسرورا o واما من اوتی کتٰبه وراء ظهره o فسوف یدعو اثبورا o و یصلٰی سعیرًا o.(۱)

”اے انسان بے شک تجھے اپنے رب کی طرف ضرور دوڑنا ہے پھر اس سے ملنا ہے تو وہ جو اپنا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے اس سے عنقریب سہل حساب لیا جائے گا۔ اور اسے گھر والوں کی طرف شاد شاد پلٹے گا اور وہ جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے وہ عنقریب موت مانگے گا اور بھڑکتی آگ میں جائے گا۔“

2: فاما یاتینکم منی هدًی فمن اتبع هدای فلا یضلّ ولا یشقیٰ o و من أعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکاً (۲)

---

(۱) سورہ انشقاق : ۶ تا ۱۲ (۲) سورہ طہ : ۱۲۳ ، ۱۲۴

"پھر اگر تم سب کو میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا وہ نہ بہکے نہ بد بخت ہو اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو بیشک اس کے لئے تنگ زندگانی ہے۔"

3: یٰبنی اٰدم امّا یا تینکم رسل منکم یقصّون علیکم اٰیٰتی فمن اتّقٰی واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون والّذین کذّبوا باٰیٰتنا واستکبروا عنھا اولٰئک اصحٰب النّار ھم فیھا خٰلدون (۱)

"اے آدم کی اولاد اگر تمھارے پاس تم میں سے رسول آئیں میری آیتیں پڑھتے تو جو پرہیز گاری کرے سنورے تو اس پر نہ کچھ خوف اور نہ کچھ غم اور جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں اور ان کے مقابل تکبر کیا وہ دوزخی ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا.

4: وللّٰہ مافی السّموات وما فی الارض لیجزی الّذین اساء وا بما عملوا ویجزی الّذین احسنوا بالحسنٰی (۲)

"اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں تا کہ برائی کرنے والوں کو ان کے کئے کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔"

5: ومن یّشاقق الرّسول من بعد ما تبیّن لہ الھدٰی ویتّبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولّی ونصلہ جھنّم وساء ت مصیرًا. (۳)

"اور جو رسول کا خلاف کرے بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر کھل چکا اور

---

(۱) سورہ اعراف ۳۵،۳۶ (۲) النجم ۳۱ (۳) النساء ۱۱۵

مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے۔ اور کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی۔"

6: انّا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنٰه سميعًا بصيرًاo انّا هدينٰه السّبيل امّا شاكرًا واما كفورًا (۱)

"بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے کہ وہ اسے جانچیں تو اسے سنتا دیکھتا کر دیا بے شک ہم نے اسے راہ بتائی یا حق مانتا یا ناشکری کرتا۔"

مذکورہ بالا آیات قرآنی نے اس امر کو پوری طرح واضح کر دیا کہ انسان کو بیکار محض پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اسے کچھ ذمہ داریوں کی انجام دہی کیلئے دنیا میں بھیجا گیا ہے اہل سنت و جماعت نے اس معنی یعنی انسان کو مکلّف بالاحکام بنایا گیا ہے۔ کی جامع تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔ هو توجه الخطاب من الله بالامر والنّهى الى عباده (۲)

"امر و نہی پر مشتمل اللہ تعالیٰ کے خطاب کا اسکے بندوں کی طرف متوجہ ہونا۔"

انسان مکلّف بالاحکام کب بنتا ہے۔

وہ کونسی صفات و شرائط ہیں جن کے پائے جانے سے انسان احکام شریعت کا اہل اور ان کا مکلّف قرار پاتا ہے۔

(۱) انبیاء و مرسلین کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے خطاب کی انسان کی طرف متوجہ ہونے کی اطلاع پانا۔ کیونکہ جب تک خطاب الٰہی نہ ہوگا انسان کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ

---

(۱) الدھر ۲،۳ (۲) اصول الدین بغدادی ص ۲۰۷

سے مکلّف بنایا گیا ہے اسلئے ضروری ہے کہ انسان تک اس خطاب الٰہی کی اطلاع پہنچ جائے جس کا اسے مکلف بنایا گیا ہے لاعلمی کی صورت میں اس سے کسی شرعی حکم کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا قرین قیاس دکھائی نہیں دیتا۔

(۲) جن احکام کی ادائیگی کا انسان سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ وہ ان پر تمکن اور قدرت بھی رکھتا ہو اگر وہ عقائد ہیں تو اسے پوری طرح ان کا تصور اور فہم بھی حاصل ہو اور اگر وہ اُوامر ونواھی ادا کرنے اور نہ کرنے پر مشتمل افعال ہیں تو ان کی اُدائیگی پر بھی اسے تمکن اور قدرت حاصل ہو کیونکہ عجز اور عدم قدرت کی صورت میں وہ انسان مکلّف نہیں رہتا بلکہ وہ اس ذمہ داری سے بری قرار دیا جاتا ہے۔

(۳) وہ امر جو اللہ تعالیٰ سے صادر ہو رہا ہے۔ اس کے کرنے اور نہ کرنے پر اسے برابر کا اختیار بھی حاصل ہو یہی وجہ ہے کہ علمائے اصول فقہ نے اس غافل انسان جسے اپنی طرف خطاب الٰہی کے متوجہ ہونے کی خبر تک نہیں کو شرعی تکلیف سے بری قرار دیا ہے۔ یہ صورت سھو اور نسیان کے علاوہ ملجاء (جو اپنے فعل میں کسی قسم کے اختیار کا مالک نہیں رہتا) میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً وہ شخص جسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی شخص پر گرادیا گیا اور اس کے گرنے سے نیچے والے شخص کی موت واقع ہوگئی تو گرنے والے پر قتل کا جرم عائد نہ ہوگا۔ امام جلال الدین محلی نے یہی بات بڑی خوبصورتی اور تفصیل سے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں والصّواب امتناع تکلیف الغافل و الملجاء امّا الاوّل وھو من لایدری کا لنّائم والسّاھی فلأن مقتضی التکلیف بالشئی الاتیان بہ امتثالا و ذالک یتوقّف علی العلم بالتکلیف بہ والغافل لایعلم ذالک فیمتنع تکلیف وان وجب علیہ

بعد يقظيته ضمان ما اتلفه من المال وقضاء مافاته من الصّلاة فى زمان غفلته لوجود سببها وامّا الثانى وهو من لايدرى ولامندوحة له عما الجئى اليه كالملقیٰ من شاهق على شخص يقتله لامندوحة له من الوقوع عليه فامتناع تكليفه بالملجاء اليه او بنقيضه لعدم قدرته على ذالك لان الملجا اليه واجب الوقوع ونقيضه ممتنع الوقوع ولا قدرة على واحد من الواجب والممتنع (١)

اور حق یہ ہے کہ غافل غفلت وبھول سے کام لینے والا اور مجبور و بے اختیار شخص شرعی تکلیف سے مستثنٰی ہے پہلا اس لئے کہ وہ جانتا ہی نہیں جیسے سونے والا اور بھولنے والا کیونکہ کسی چیز کے ساتھ تکلیف دینے کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ہوش وخرد کے ساتھ ادا کیا جائے اور یہ معاملہ اس چیز کے علم پر موقوف ہوتا ہے۔ جبکہ غافل شخص تو اس کا علم ہی نہیں رکھتا اس لئے اسے مکلّف ٹھہرانا ممتنع اور ناممکن ہے اگرچہ سونے والے پر بیداری کے بعد جو اس نے مال ضائع کیا ہے اس کی ضمان واجب ہے اور غافل پر دوران غفلت فوت ہونے والی نماز کی قضاٗ ضروری ہے کیونکہ اس کا سبب پایا جا رہا ہے اور دوسرا اس لئے کہ اسے جس چیز کے لئے مجبور و مقہور کیا جا رہا ہے اس میں اس کی رضا واختیار ہی نہیں مثلاً وہ شخص جسے پہاڑ کی چوٹی سے ایک شخص پر گرا دیا گیا اور اس نے اسے مار ڈالا کیونکہ ایسی صورت میں اس پر گرنے والے کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں بایں معنیٰ کہ ملجاء الیہ (کسی کام پر مجبور کیا ہوا) واجب الوقوع ہے اور اسکی ضد ممتنع الوقوع ہے۔ جب کہ ایک شخص کو واجب اور ممتنع پر قدرت ہو نہیں سکتی۔ بہرحال ثابت

(١) شرح المحلی علی جمع الجوامع ابن السبکی ١ / ٤٠ / ٤١

یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس تکلیف سے مخاطب کیا ہے اس پر عمل درآمد اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان اس پر تصرّف کرنے میں آزاد ہو اور اسے یہ بھی شعور ہو کہ وہ اس پر عمل کرنے اور عمل نہ کرنے میں قادر و مختار ہے۔ انسان کی ذات میں یہی وہ آزادی ہے جو احکام شریعت کی تکلیف اور ان کی بجا آوری کی اصل بنیاد ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بیان کیا گیا ہے۔

و نفس وما سوّٰھا o فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۔(۱)

''اور جان کی قسم اور اسکی جس نے اسے ٹھیک بنایا پھر اسکی بدکاری اور اسکی پرہیز گاری دل میں ڈالی'' **انّا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنٰه سمیعًا بصیرًا انّا ھد ینٰه السّبیل امّا شاکرًا واما کفورًا (۲)**

بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے کہ وہ اسے جانچیں تو اسے سنتا دیکھتا کردیا بے شک ہم نے اسے راہ بتائی یا حق مانتا یا ناشکری کرتا۔ یعنی ہم نے انسان کو اپنا حکم ماننے اور نہ ماننے کی اہلیت وقابلیت سے ہم کنار کردیا کہ وہ پہلی صورت میں اجر وثواب اور دوسری صورت میں زجر و عذاب کا حق دار رہے۔ اس حقیقت کو اس قول الٰہی میں مزید واضح کردیا گیا۔

لا یکلّف اللّٰه نفسًا الّا وسعھا لھاما کسبت وعلیھا ما اکتسبت (۳)

اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اسکی طاقت بھر اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔

---

(۱) سورہ شمس:۵،۶ (۲) سورہ الانسان : ۲،۳ (۳) سورہ بقرہ : ۲۸۶

تکوینی اُوامر اور تکلیفی اُوامر

مخلوقات کی طرف صادر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے اُوامر واحکام دو طرح کے ہیں تکوینی اور تکلیفی تکوینی اُوامر وہ ہیں جو براہ راست اس کی مخلوق کو ملتے ہیں اور ان میں مخلوق و مامور کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور وہ اسکے کلمہ کن سے وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

انّما امرہ اذا اراد شئیًا ان یقول له کن فیکون (۱) اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے اللہ جل جدہ کے تکوینی اُوامر کا ظہور عالم جمادات نباتات اور حیوانات اور اسکی کونی ایجادات میں ہو رہا ہے جب کہ اسکے تکلیفی اُوامر او اُحکام صرف جنّوں اور انسانوں کی طرف ہی متوجہ کئے گئے ہیں اسی مخلوق سے ہی ان کے کرنے اور نہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ گویا تکوینی اُوامر کی حقیقت تسخیر اور تعمیل حکم کی بہر حال پابندی پر قائم ہے اور تکلیفی اوامر کی طبعیت و حقیقت ابتلا اور امتحان پر مبنی دکھائی دیتی ہے اللہ تعالیٰ کا یہ قول مبارک اس فرق کو کس واضح انداز سے بیان کر رہا ہے۔ الم تر ان اللّٰہ یسجد له من فی السّموات ومن فی الارض والشّمس والقمر والنّجوم والجبال والشّجر والدّوابّ وکثیر من النّاس وکثیر حقّ علیه العذاب (۲)
کیا تم نے نہ دیکھا کہ اللہ کیلئے سجدہ کرتے ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت آدمی اور بہت وہ

---

(۱) سورہ یٰسین : ۸۱ (۲) سورہ الحج : ۱۸

ہیں جن پر عذاب مقرّر ہو چکا۔

اس قول ربانی سے صاف طور پر ظاہر ہوا کہ زمین و آسمان سورج چاند تارے اور جن و انسان کے سوا باقی تمام مخلوقات کی طرف تکوینی امر صادر ہو رہا ہے جس کا نتیجہ جبر اور تسخیر دکھائی دیتا ہے اور جس کا تنفیذ اور تعمیل میں انحراف اور عدم کا کوئی امکان نہیں مگر جن و انسان کی طرف جو امر الٰہی متوجہ ہو رہا ہے اس تکلیفی حکم میں بہت سے جنوں اور انسانوں میں تخلف انحراف اور عدم اطاعت نظر آ رہی ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے سجدہ جو کہ طاعت و فرمانبرداری کا اعلیٰ ترین درجہ ہے کہ تمام مخلوقات کی طرف کسی تخصیص و استثناء کے بغیر منسوب کر دیا مگر اسی سجدہ کو تمام انسانوں کی بجائے ان کو ایک کثیر تعداد کی طرف منسوب فرمایا اور ان کی ایک کثیر جماعت کو عذاب کا حقدار ٹھہرایا۔

یہی وہ اعزاز و افتخار ہے جس سے اللہ جل شانہ نے انسان کو اپنی دوسری مخلوقات سے منفرد و ممتاز کر دیا انسانی وجود میں رکھا ہوا علمی ادراک اور اسکی ذات میں ودیعت کی گئی آزادی و اختیار ہی تو ایسا جوہر تھا جس سے انسان خلافت الٰہی کے مقام پر فائز ہوا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ (۱)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں آئندہ تین آیات کریمہ بھی انسان کے اس کمال و مقام کو ظاہر کر رہی ہے۔

---

(۱) البقرہ : ۳۰ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ ص ۲۰/۱۵

1: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ○ ثمّ رددنٰہ اسفل سافلین○ الّا الّذین آمنوا وعملو ا الصّٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون (۱)

بے شک ہم نے آدمی کواچھی صورت پر بنایا پھراسے ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا مگر جوایمان لائے اوراچھے کام کئے کہ انہیں بے حد ثواب ہے۔

2: والعصر○ انّ الانسان لفی خسر ○الّا الّذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحقّ وتواصوا باالصبر (۲)

اس زمانہ محبوب کی قسم بے شک آدمی ضرور نقصان میں ہے مگر جوایمان لائے اوراچھے کام کئے اورایک دوسرے کوحق کی تاکید کی اورایک دوسرے کوصبر کی وصیت کی۔

3: ولقد کرّمنا بنی ادم وحملنٰھم فی البرّ والبحر ورزقنٰھم من الطیّبٰت وفضّلنٰھم علیٰ کثیر ممّن خلقنا تفضیلًا (۳)

بے شک ہم نے اولاد آدم کوعزت دی اوران کوخشکی اورتری میں سوار کیااوران کوستھری چیزیں روزی دیں اوران کواپنی بہت مخلوق سے افضل کیا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مکلّف ہےاوراسکی تکلیف ابتلاء و امتحان پر قائم ہے۔ جس کی وجہ سے ہی وہ اُجر وثواب اور زجر وعقاب کا استحقاق رکھتا ہے۔اوراس کی یہ ابتلاً اسی صورت میں پائی جاسکتی ہے جب وہ حریت یعنی وہ اس شرعی تکلیف کے ماننے یانہ ماننے کی قوت کامالک ومختار بھی ہو۔ اس خلاصے کا ادراک انتہائی اہمیّت رکھتا ہے۔ بلکہ جب ہم اس کو جہاد اور دعوت الی الحق کے موضوع کے ساتھ منسلک کریں تواسکی اہمیّت وافادیّت اوربھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ

(۱) سورہ التین : ۶،۳ (۲) العصر (۳) الاسراء ۷۰

داعی الی اللہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقین واعتقاد کے بعد اسکے احکام پر عمل کرنے کے سلسلے میں مکلّف بنائے گئے ہیں اس آگاہی کے بعد وہ انہیں اس قرارداد پر عمل وعدم عمل کے معاملے میں آزاد چھوڑ دے کیونکہ اگر انہیں ان اعتقادی وعملیاتی تکلیفات پر عمل پیرا ہونے کیلئے مجبور کردیا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہین ابتلاء دی گئی تکلیف کا معنی و مفہوم ہی ختم ہوجائے گا۔ اور وہ اس صورت میں کسی اجر وثواب کے حقدار نہ ہوں گے دعاۃ الی اللہ اور ان کے امیر اعلیٰ رسول اللہ ﷺ کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

1: وقل الحقّ من رّبّکم ۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر انّا اعتدنا للظّٰلمین نارًا (۱)

اور فرمادو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے بے شک ہم نے ظالموں کیلئے آگ تیار کررکھی ہے۔

2: لااکراہ فی الدّین قد تبیّن الرّشد من الغیّ فمن یکفر بالطّاغوت ویومن باللّٰہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لاانفصام لھا. (۲)

کچھ زبردستی نہیں دین میں بے شک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں

3: ربما یودّ الّذین کفروا لو کانوا مسلمین ذرھم یأکلوا

---

(۱) سورہ الکہف : ۲۹ (۲) البقرہ : ۲۵۶

ویتمتعوا ویلههم الأمل فسوف یعلمون (۱)

بہت آرزوئیں کریں گے کافر کاش مسلمان ہوتے انہیں چھوڑ کہ کھائیں اور برتیں اور امید انہیں کھیل میں ڈالے تو اب جانا چاہتے ہیں

4: فذرنی ومن یکذب بهذا الحدیث سنستدرجهم من حیث لا یعلمون o وأملی لهم ، ان کیدی متین (۲)

تو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے اسے مجھ پر چھوڑ دو قریب ہے کہ ہم انہیں آہستہ آہستہ لے جائیں جہاں سے انہیں خبر نہ ہو گی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے۔

5: وقل للذین لایؤمنون اعملوا علی مکانتکم انا عملون o وانتظروا انا منتظرون o ولله غیب السمٰوٰت والارض والیه یرجع الأمر کله فاعبده وتوکل علیه ، ومار بک بغافل عما تعملون (۳)

اور کافروں سے فرماؤ تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کرتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب اور اسی کی طرف سب کاموں کی رجوع ہے تو اسکی بندگی کرو اور اس پر بھروسہ رکھو اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں

ان آیات کریمہ میں اللہ جل مجدہ اوّلا اپنے نبی ﷺ اور ثانیا آپ کے ساتھ ان تمام دعاۃ الی اللہ کو خطاب فرماتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو تکالیف اور احکام عائد کئے ہیں وہ

(۱) الحجر : ۳۱۲ (۲) القلم :۴۴،۴۵ (۳) سورہ ہود :۱۲۱-۱۲۳

انہیں بجالائیں۔ اور وہ اس جزا پر بھی نظر رکھیں جو آخرت میں ان کی منتظر ہے مگر اس پیغام کے ابلاغ کے بعد انہیں آزاد چھوڑ دیں تاکہ یہ تکلیفی معاملہ تکوینی حکم اور قضائے نہ ہوسکے اور اللہ تعالیٰ کے تکوینی اور تکلیفی خطاب میں فرق قائم رہے۔

شرعی تکلیف اور دنیا میں سزا کا مسئلہ

اسلامی تکلیفات کے ساتھ ساتھ اس جہان میں شرعی عقوبات اور سزاؤں کو بھی منسلک رکھا گیا ہے۔ جس سے مکلّف انسان کی حریت اور آزادی کی نفی ہوتی ہے اور وہ اپنے تصرف اور اختیار کے معاملے میں بھی بے بس دکھائی دیتا ہے مثلاً قتل جو قصاص زنا جو رجم یا کوڑے مارنا چوری جو ہاتھ کاٹنا اور بدکاری کی تہمت لگانا جو حد کا موجب بنتا ہے۔ یہ سزائیں اس اَمر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انسان اپنے اختیار و تصرف میں آزاد نہیں ہے تو اس اشکال کا حل یہ ہے کہ ان محرّمات کی سزائیں اس وقت نافذ العمل ہوتی ہیں جب ان کا مرتکب شخص اس شریعت کا اذعان و اقرار کر لیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم کر دیا ہے اور یہ اذعان و اقرار ایمان اور اسکے تقاضوں کو تسلیم کرنے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے کیونکہ جس نے ابھی تک اسلام کے مبادی اور اسکے بنیادی ارکان کو ہی تسلیم نہیں کیا اسے اس جہاں میں ان سزاؤں سے دوچار نہیں کیا جاتا مگر جب کوئی شخص اسلامی عقائد کا ایقان کرنے کے ساتھ ان کا اعلان و اظہار کر دیتا ہے تو یہ اذعان اس بات کا متقاضی ہے کہ ان عقائد کی روشنی میں پیدا ہونے والے تمام شرعی اُحکام کو بھی وہ خوشدلی سے قبول کر رہا ہے۔

نیز اسلامی شریعت اس دنیوی سزا کو صرف ان معاصی اور خطاؤں کے ساتھ

لاحق کرتی ہے جن سے حقوق العباد ضائع ہوتے ہیں یا جن سے انسانی معاشرے میں فساد اور حرج داخل ہوتا ہے مگر وہ معاصی اور خطائیں جن سے صرف حقوق اللہ کی پائمالی ہوتی ہے ان کے مقابل اس دنیا میں کوئی عقاب وسزا نہیں رکھی گئی بایں طور بھی انسان کی حریت وآزادی برقرار نظر آتی ہے۔ کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے یا ان سے دور رہے۔(۱)

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جن معاصی اور جرائم سے ظلم وتعدی پھیلتی ہے یا دوسرے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے ان کے مرتکب پر تو اس دنیا میں عذاب وعقاب مقرّر رہے مگر یہ عقاب بھی قصاص یا مظلوم افراد کے حقوق کے تحفظ اور مساوات کی بنیاد پر نافذ کیا جاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی سزا نہیں ہے مثلاً چور قاتل زانی ڈاکو اور قاذف پر جاری کی جانے والی سزاؤں کا تعلق امر الٰہی کی مخالفت سے نہیں بلکہ یہ تو معاشرے میں فساد اور دوسرے لوگوں کو پہنچنے والی ضرر اور تکلیف سے منسلک ہیں (۲)

چنانچہ بہت سے ایسے جرائم و معاصی بھی ہیں جن میں ظلم اور دوسرے لوگوں کو کوئی ضرر اور تکلیف نہیں پہنچتی ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں فوری عقاب وسزا مقرر نہیں کی بلکہ ان پر سزا جزا کو قیامت کے روز کیلئے ذخیرہ کر رکھا ہے۔ اور اس جہان میں ان کے مرتکب افراد کو آزادی دے دی ہے۔

جہاد آئمہ اسلام کی نظر میں

مستند کتب فقہ میں باب الجہاد کا آغاز اسی اساسی اور حقیقی جہاد یعنی امر

---

(۱) الجہاد فی الاسلام ڈاکٹر رمضان بوطی شامی (۲) حریۃ الانسان فی ظل عبودیتہ للہ ڈاکٹر رمضان شامی

بالمعروف نہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کے عنوان سے ہی کیا گیا ہے اور جہاد قتالی کو اسکی تمام انواع سمیت اسکی فرع قرار دیا گیا ہے۔ امام شرف الدین نووی رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب المنہاج میں باب الجہاد کے آغاز میں رقم طراز ہیں ومن فروض الکفایة القیام باقامة الحجج وحلّ المشکلات فی الدّین وبعدوم الشرع والامر بالمعروف والنهی عن المنکر(۱). دین کی حقانیت پر دلائل پیدا کرنا شریعت میں مشکلات کو حل کرنا شرعی علوم کی تحصیل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا فرض کفایہ میں شامل ہے۔

امام الدّردیر مالکی رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب اَقرب المسالک کے باب الجہاد میں فرماتے ہیں ببیان وجوب القیام بنشر علوم الشّریعة والامر بالمعروف والنهی عن المنکر ....ودعوا أوّلا وجوباً الی الاسلام ولو بلغتهم دعوة النّبی ﷺ(۲)

اسلامی علوم کی نشر واشاعت اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا واجب ہے۔ اوّلا واجب ہے کہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جائے اگر چہ ان لوگوں تک نبی اکرم ﷺ کا پیغام پہنچ بھی چکا ہو۔ علامہ ابن رشد مقدّمات میں کتاب الجہاد بیان انواعہ کے عنوان کے تحت ارشاد فرماتے ہیں۔

والجهاد ینقسم علٰی اربعة اقسام جهاد بالقلب و جهاد باللسان وجهاد بالید وجهاد بالسّیف وجهاد باللسان الامر بالمعروف ونهی

(۱) مغنی المحتاج شرح المنہاج نووی ۲۱۰/۴ (۲) الشرح الصغیر : ۲۷۲/۲

عن المنکر و من ذالک ما أمر اللّٰہ بہ من جھاد المنافقین لأنہ عزّو جلّ قال یاایّھا النبیّ جاھد الکفّار و المنافقین (۱) فجاھد الکفّار بالسّیف و جاھد المنافقین باللّسان (۲) جہاد چار قسم کا ہے دل سے زبان سے ہاتھ سے اور تلوار سے جہاد کرنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا زبان کا جہاد ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے اے نبی مکرم کافروں اور منافقوں سے جہاد کریں یعنی کفار سے تلوار کے ساتھ اور منافقین سے زبان کے ساتھ۔۔

امام منصور بن یونس البھوتی اپنی معروف تصنیف کشاف القناع کے باب الجہاد میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ ببیان فروض الکفایۃ التی یجب البدأ بھا من ذالک اقامۃ الدّعوہ الی دین الاسلام و دفع الشبہ عنہ و اقامۃ الصناعات التی یحتاج الیھا النّاس فی مصالحھم الدینیّۃ و الدنیویّۃ و البدنیّۃ و المالیّۃ لان أمر المعاد و المعاش لاینتظم الاّ بذالک (۳) وہ فرض کفایہ کام جن کا اپنانا واجب ہے ان میں سے ایک دین اسلام کی طرف دعوت اور اس سے ہر شبہ اور الزام کو دور کرنے کا اہتمام کرنا ہے۔ اور دوسرا ایسی صنعتوں اور فنون کا عمل میں لانا جن سے لوگوں کے دینی دنیاوی بدنی اور مالی منافع وابستہ ہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی انسانیت کی دنیا و آخرت کا معاملہ منسلک ہے۔

(۱) سورہ توبہ: ۹/۷۳ (۲) مقدمات ابن رشد: ص ۲۵۹ (۳) کشاف القناع عن متن الاقناع البھوتی ۳/۳۳

جہاد بالدّعوت ایک تبلیغی حکم جو عامۃ المسلمین کو شامل ہے

یاد رہے کہ جہاد دعوت الی اللہ اور ایک تبلیغی حکم ہے جو جہاد قتالی کی طرح امارت وامامت سے وابستہ دکھائی نہیں دیتا دعوت الی اللہ اور لوگوں کو اسلامی عقائد و تعلیمات سے آگاہی بخشنے کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے ہر فرد پر عائد کی ہے'' انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے حکام اور اُمراء کا انتظار نہ کریں۔ البتہ اس جہادی رکن کا وجوب فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے کہ جب اس رکن کی کماحقہ اُدائیگی پر ہمت اور قابلیت رکھنے والی ایک جماعت میدان عمل میں اتر گئی تو دیگر تمام لوگوں سے اس کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر، واولئک ھم المفلحون (۱)

اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے۔

جہاد بالدّعوت جبر واکراہ سے پاک اور وعظ ونصیحت پر مبنی ہے۔ جہاد بالدّعوت میں داعی کو صرف تذکیر ونصیحت اور وعظ وتبلیغ تک محدود رہ کر جبر واکراہ سے بچنا از حد ضروری ہے اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

1: فذکر انّما انت مذکّر ○ لست علیھم بمصیطر ○ الّا من تولّیٰ

---

(۱) سورہ آل عمران :۱۰۴

و کفر ٥ فیعذّبہ اللّٰہ العذاب الاکبر ٥ (١)

تو تم نصیحت سناؤ تم تو یہی نصیحت سنانے والے ہو تم کچھ ان پر کڑوڑا نہیں ہاں جو منہ پھیرے اور کفر کرے تو اسے اللہ بڑا عذاب دے گا۔

2: **فان اعرضوا فما ارسلنک علیھم حفیظاً ان علیک الّا البلاغ ۔(٢)**

تو اگر وہ منہ پھیریں تو ہم نے تمہیں ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تم پر تو نہیں مگر پہنچا دینا

3: **وامّا نرینک بعض الّذی نعدھم او نتوفّینک فانّما علیک البلاغ وعلینا الحساب (٣)**

اور اگر ہم تمہیں دکھا دیں کوئی وعدہ جو انہیں دیا جاتا ہے یا پہلے ہی اپنے پاس بلائیں تو بہر حال تم پر تو صرف پہنچانا ہے اور حساب لینا ہمارا ذمہ۔

4: **فان تولّیتم فاعلموا انّما علی رسولنا البلٰغ المبین (٤)**

پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ صرف واضح طور پر حکم پہنچا دینا ہے۔

مذکورہ آیات قرآنی میں جو مدنی ہیں وہ جہاد بالسّیف کے حکم کے بعد نازل ہوئی تھیں جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ دعوت الی اللہ کا معاملہ ایک وعظ و اختیاری نصیحت سے ہی متعلق ہے۔

اس میں جبر و اکراہ نام کی کوئی شئی شامل نہیں دعوت حق کا یہی انداز اسلامی تاریخ کے ہر دور میں کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ محدث ابن ابو حاتم رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ

---

(١) سورہ غاشیہ :٢١،٢٣ (٢) شوریٰ: ٤٨ (٣) الرعد :٤٠ (٤) المائدہ : ٩٢

راوی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک اسبق نامی غلام کہتا ہے کہ میں آپ کا عیسائی غلام تھا تو آپ مجھ پر اسلام کی دعوت پیش کرتے جسے میں قبول نہ کرتا آپ ارشاد فرماتے اے اسبق اگر تو مسلمان بن جائے تو تو مسلمانوں کے کام آسکتا ہے مگر میرے انکار پر آپ یہ آیت مبارکہ تلاوت کرتے۔

لا اکراہ فی الدّین (۱) دین اسلام میں کوئی زبردستی نہیں۔

ایک اشکال اور اس کا حل

مذکورہ بالا بحث سے ثابت کر دیا گیا کہ دعوت الی اللہ کی بنیاد اختیاری وعظ و نصیحت پر استوار کی گئی ہے اس میں جبر اور زبردستی کا کوئی عنصر شامل نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث مبارک کا معنی کیا ہوگا **عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ ﷺ قال أمرت ان أقاتل النّاس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الّا اللّٰہ وأنّ محمدًا رسول اللّٰہ ویقیموا الصّلوۃ ویؤتوا الزّکا فاذا فعلوا ذالک عصموا منّی دمائھم واموالھم الاّ بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ.. (۲)**

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں جب وہ یہ کام کریں گے تو میری طرف سے ان کی جانیں اور ان کے اموال

(۱) البقرہ :۲۵۶ (۲) صحیح بخاری، صحیح مسلم

محفوظ ہو جائیں گے۔ مگر اسلام کا حق باقی رہے گا اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔
اس حدیث سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ دعوت اسلام کو آزادی واختیار کے انداز میں نہیں بلکہ جبر واکراہ کی صورت میں پیش کرنا ضروری ہے۔ اہل علم نے اس اشکال کا حل یوں پیش کیا ہے کہ حدیث مبارک میں وارد ہونے والے کلمہ اقاتل پر غور کرنے سے یہ شبہ زائل ہو جاتا ہے کیونکہ اقاتل اور اقتل میں فرق واضح ہے اگر تو حدیث شریف میں یوں وارد ہوتا کہ امرت ان اقتل الناس مجھے لوگوں کے قتل کرنے کا حکم ملا ہے تو یہ حدیث دعوت دین کے معاملے میں جبر واکراہ پر دلیل بنتی جبکہ اقاتل کا صیغہ لایا گیا ہے جو باب. مفاعلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں طرفین کی مشارکت کا پایا جانا ضروری ہے جیسا کہ عرب کا قول ہے لاقاتلن ھولاء علی عرضی میں ان لوگوں سے اپنی عزت اور آبرو پر لڑائی کروں گا تو اس سے یہی معنی واضح ہوتا ہے کہ جب وہ میری عزت وآبرو کے سلسلہ میں کوئی تعدّی اور زیادتی کریں گے تو میں ان کے اس عدوان واقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا چنانچہ حدیث مبارک کا معنی یہ ہوا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں کو دعوت ایمان دوں اور اپنی اس دعوت پر آنے والی ہر تعدّی اور سرکشی کا سد باب کروں اگر چہ مجھے اس سلسلے میں ان تعدّی کرنے والوں سے قتال بھی کرنا پڑے کیونکہ یہ میرا وہ مشن ہے جسے پورا کرنے کا حکم مجھے میرے رب نے دیا ہے۔ بہر حال حدیث شریف میں وارد ہونے والے مقاتلہ سے (مجابھة العدوان القتالی بمثله) جنگ وجدال پر مبنی زیادتی کا جواب اسی طور پر دینا ہی مراد لیا گیا ہے۔ (۱)

---

(۱) الجہاد فی الاسلام ڈاکٹر رمضان شامی

دارالاسلام، اسلامی معاشرہ اور جہاد قتالی

سیرت رسول ﷺ کے ہر قاری پر یہ بات خوب واضح ہے کہ وہ دعوت اسلامی جسے نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پیش فرمایا اس کا دائرہ کار جاہلی معاشرہ تک ہی محدود تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے پاس نہ تو کوئی مربوط اور مستقل قوت و جمعیت تھی۔ اور نہ ہی وہ کسی ایسی زمین کے مالک تھے کہ جس پر وہ اپنا اجتماعی وجود متعارف کرائے بلکہ وہ تو مشرک و گمراہ لوگوں کی اکثریت میں بکھرے ہوئے چند افراد کی اقلیت تھی اور مکہ مکرمہ کی سرزمین ہی ان کیلئے پناہ گاہ اور مسکن کی حیثیت رکھتی تھی مکہ مکرمہ کے اس جاہلی معاشرے اور اس میں جاری نظام حکومت میں رہتے ہوئے وہ صرف اپنے عقیدے کی دعوت تک ہی محدود تھے اندریں حالات جہاد قتالی کسی طور سے بھی ان کیلئے مناسب نہ تھا۔ اسی وجہ سے مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کا جہاد دعوت الی اللہ تک ہی موقوف رہا آپ اور آپ کے صحابہ کرام مسلسل ۱۳ سال تک مشرکین مکہ کی ایذاء اور ان کا ظلم وستم برداشت کرتے رہے۔

جہاد قتالی کے وجوب کا اصلی سبب

جب ہادی برحق نبی کریم ﷺ نے مدینہ شریف میں مستقل طور پر قیام فرمایا اور وہاں کے اکثر لوگ دین اسلام سے وابستہ ہوئے اور وہ سرزمین اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے مسلم بندوں کیلئے اولین مرکز قرار پا گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دو انعام عطا فرمائے دارالاسلام دین الٰہی کا اولین مرکز اور اسکے مومن بندوں کا مستقر اور پہلا اسلامی معاشرہ جس میں ایک جامع اسلامی نظام کے تحت ایک امت مسلمہ کا معنی منظر

عام پر آیا چنانچہ ان دونعمتوں کے میسر آنے پر اسلامی حکومت بھی اپنے ارکان ولوازمات کے تحت معرض وجود میں آگئی واضح رہے کہ دور حاضر میں بین الاقوامی قانون کے مطابق حکومت کے مفہوم میں تین عناصر کا پایا جانا ضروری ہے زمین، قوم اور ایک نظام وقانون جو اس قوم کے وجود کا ضامن ہو اور اس کے تعلق کو اس سرزمین کے ساتھ راسخ کرے چنانچہ جب مسلمانوں نے مدینہ منورہ میں مستقل طور پر قیام کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ تینوں انعامات اور حقوق عطا فرمادیئے گویا یہ اس امر کا اعلان تھا کہ اللہ کی زمین پر پہلی اسلامی حکومت پیدا ہو چکی ہے بہر حال یہ تین وہ اعلیٰ و اہم ترین حقوق تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر مسلمانوں کو عطا فرمادیئے اور ان کے تحفظ کیلئے انہیں ان پر وارد ہونے والے ہر ظلم وتعدّی کے دفاع کا حکم بھی جاری کردیا اور مدینہ منورہ میں ان کے استقرار کے ساتھ ہی جہاد وقتال کی اجازت بھی دے دی گئی جہاد وقتال کی مشروعیّت اور اجازت پر پہلی آیت مبارکہ جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ تھی اذن للذین یقتلون بانّهم ظلموا وانّ اللّٰه علی نصرهم لقدیر (۱) پروانہ عطا ہوا انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

دارالاسلام

یہ وہ پہلا انعام تھا جو اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو عطا فرمایا اور اس کے دفاع اور اس وطن اسلامی کے تحفظ کیلئے جنگ وقتال کرنا ان کی ذمہ داری قرار

---

(۱) سورہ حج :۳۹

دی گئی ذیل میں دارالاسلام کی آئمہ مذاہب اربعہ کے نزدیک متفقہ تعریف پیش کی جارہی ہے۔علامہ ڈاکٹر رمضان شامی فرماتے ہیں ھی ماالتّفق علیہ آئمة المذاهب الأربعة البلدة او الارض الّتی دخلت فی منعة المسلمین و سیادتهم بحیث یقدرون علیٰ اظهار اسلامهم والامتناع من أعداٴهم سواء تّم ذالک بفتح و قتال أو بسلم ومصالحتهم أو نحو ذالک (۱)

مذاہب اربعہ کے آئمہ کرام کے نزدیک دارالاسلام کی متفقہ تعریف یہ ہے کہ وہ شہر یا زمین جو مسلمانوں کی قوت وحفاظت اوران کی قیادت میں داخل ہوجائے بایں طور کہ وہ اپنے اسلام کے عملی اظہار کی طاقت رکھتے ہوں اوراپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنے پر بھی قادر ہوں یہ تسلّط و اقتدار انہیں فتح وقتال سے ملے یا امن و مصالحت سے یاکسی اورمناسب ذریعے سے۔

دارالاسلام کی تعریف کے متعلق اگر چہ فقہاء اسلام کی عبارات میں اختلاف ہے مگر تمام حضرات کا اس جوہری معنی پر اتفاق ہے کہ مسلمان اس سرزمین پر اپنی ایسی سیادت وقیادت کے مالک ہوں کہ ہرایک کو وہاں پراسلامی احکام اوردینی شعائر کے اعلان واظہار کی مکمل آزادی ہو کسی بھی زمین پر یہ اسلامی قیادت اسے دارالاسلام کا درجہ دے سکتی ہے خواہ وہاں کے باشندے مسلم ہوں یا غیر مسلم مثلاً ایسی زمین یا شہر جسے مسلمانوں نے فتح کیا اور وہاں کے باشندوں کو جزیہ وغیرہ کی شرط پر رہنے کی اجازت دے دی تو وہ زمین وشہر بھی دارالاسلام ہی قرار پائے گا۔(۲)

---

(۱) تحفة المحتاج ۲۶۹/۹، المغنی ابن قدامہ ۲۴۷/۹، حاشیہ ابن عابدین ۲۶۰/۳، مغنی المحتاج ۲۳۹/۴

(۲) تحفة المحتاج ۲۶۹/۹،

دارالاسلام کا حکم

جو سرزمین دارالاسلام کا درجہ قرار پا جاتی ہے تو اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کا دفاع اور تحفظ واجب ہو جاتا ہے دوسرا حکم یہ ہے کہ وہاں پر تمام اسلامی احکامات کی تطبیق وتنفیذ ضروری ہو جاتی ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ پھر وہ دارالکفر یا دارالحرب میں متبدل نہیں ہوسکتا یعنی اگر کوئی اسلامی شہر کسی کمزوری یا کسی بیرونی طاقت کے تسلط یا استعمار کی وجہ سے کسی بھی صورتحال کا شکار ہو جائے تو بھی وہ دارالاسلام کے حکم میں رہے گا۔ ایسی صورتحال کے پیدا ہو جانے پر مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا دفاع کریں اور ان متسلطین کے ساتھ قتال کریں اس کی واضح ترین مثال دیار فلسطین ہے کہ اس پر اسرائیلی غاصبوں سے جہاد وقتال کرنا دین اسلام کے اہم تقاضے کی تکمیل قرار پاتا ہے۔

مگر احناف کی اکثریت کا موقف یہ ہے کہ تین شرائط کے پائے جانے سے دارالاسلام دارالکفر یا دارالحرب میں تبدیل ہوسکتا ہے

1: اس زمین میں کفری احکام کا اجراء ونفاذ کر دیا جائے۔

2: اسے کسی دارالکفر یا دارالحرب کے ساتھ لاحق وضم کر دیا جائے۔

3: اس میں کوئی مسلم اور ذمی اسلامی امان کے ساتھ موجود نہ رہے۔(۱)

مندرجہ بالا احکام کے ملاحظہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی بھی زمین کو دارالاسلام اعتبار کرنے میں وہاں پر اسلامی اور شرعی احکام کی تطبیق کوئی شرط نہیں البتہ وہاں کے

---

(۱) درمختار شرح تنویر الابصار ، حاشیہ ابن عابدین ۲۶۰/۳

مسلمانوں کے ذمہ اس دارالاسلام کا حق ہے۔ کہ وہ اسلامی احکام کی تطبیق وتنفیذ کریں لیکن تقصیر وکوتاہی سے بھی وہ زمین دارالاسلام ہی رہے گی اور عدم تطبیق وتعمیل کی صورت میں وہ گنہگار ومجرم قرار پائیں گے۔

تفقہ فی الدین سے عاری بعض نوجوان مسلمانوں کی فکر کے مطابق دار الاسلام کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ دارالاسلام وہی ہوگا جس میں اسلامی معاشرہ قائم ہو بایں طور کہ اس میں تمام اسلامی اور شرعی احکام معاملات وحدود وغیر ہا کی تطبیق پائی جاتی ہو اور عدم تطبیق کی صورت میں وہ دارالاسلام سے دارالحرب میں منتقل ہوجائے گا جبکہ یہ صورتحال تو اس وقت تمام بلاد اسلامیہ میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہاں معاملات وحدود وغیرہا میں شرعی احکام کی تطبیق وتنفیذ نظر نہیں آتی تو ان کے دارالحرب ہونے کی صورت میں تو وہاں کے مسلمانوں کیلئے رحلت وہجرت کرنا ضروری ہوگا اس فکر کے نتیجے میں وہ تمام بلاد اسلامیہ جو اسلام کے زیر نگیں آئے تھے انہیں ضیافت اور غنیمت کے طور پر غاصبوں اور جابروں کے سپرد کرنا ہوگا۔

امت مسلمہ

یہ وہ دوسرا حق ہے جس کے دفاع کی ذمہ داری اہل اسلام پر عائد ہوتی ہے جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ میں قیام واستقرار مل گیا تو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے وجود کے تحفظ وبقا کے لئے بھی انہیں قتال کرنے کا حکم عطا فرمایا یاد رہے کہ امت مسلمہ کے نظری وفکری وجود کی پرورش اسلامی نظام سے ہوتی ہے اور اسلامی نظام کا بروز و وجود مسلمہ کے درمیان سے ہی رونما ہوتا ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کیلئے

سند کے طور پر دکھائی دیتا ہے آئندہ سطور میں ہم اُمت اور جماعت کے معنی پر ہی گفتگو کرتے ہیں۔

کلمہ امت اور اس کا معنی

کلمہ امت بہت سے معانی رکھتا ہے مگر اس کا اصلی اور حقیقی استعمال صرف اس معنی کیلئے ہے الطّائفة من النّاس المجتمعة علی الشئی الواحد فاذا قلنا امّة نبیّنا محمّد ﷺ فهی الطّائفة الموصوفة بالایمان به والاقرار بنبوته (۱)

ایک چیز پر جمع ہونے والی لوگوں کی ایک جماعت جب ہم ہمارے نبی محمد ﷺ کی امت بولتے ہیں تو اس کا معنی وہ جماعت ہوتی ہے جو آپ پر ایمان رکھتی اور آپ کی نبوت کا اقرار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کلمہ امت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جن کی طرف آپ مبعوث ہوئے اور ان سے آپ پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امت کی دو قسمیں ہیں امت دعوت اور امت استجابت مگر اس مقام پر ہم اُمت استجابت کے معنی پر ہی بحث کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی معنی اسلامی معاشرے یا اسلامی حکومت کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے۔ امت استجابت کے معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول شاہد ہے کنتم خیر امةٍ اخرجت للنّاس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون باللّٰه (۲)

---

(۱) بصائر ذوی التمیز فی وظائف الکتاب العزیز فیروز آبادی ۸۰/۲، مفاتح الغیب امام رازی ۳۸/۳

(۲) سورہ آل عمران : ۱۱۰

تم بہتر ہوان سب امتوں میں جولوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کاحکم دیتے ہواور برائی سے منع کرتے ہواور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔اس معنی سے ثابت ہوا کہ غیر مسلم خواہ وہ کسی بھی امت و جماعت سے تعلق رکھتے ہو۔وہ اسلامی امت کے دائرے میں داخل نہیں ہوسکتے مدینہ منورہ میں جوسب سے پہلاتحریری دستور و منشور عمل میں آیا تو اسکی پہلی شق میں رسول اللہ ﷺ نے امت اسلامیہ کی تحدید و تعیین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا **المسلمون من قریش ویثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم أمة واحدة من دون النّاس** (۱)

قریش اور مدینہ اوران کے تابع ہوکران سے ملنے اوران کے ساتھ جہاد کرنے والے مسلمان باقی لوگوں سے الگ ایک امت ہیں ۔ نیز جب آپ نے یہود مدینہ کا مسلمانوں کے ساتھ ربط و تعلق ظاہر کیا تو امت اسلامیہ کے تشخص کو یوں بیان فرمایا **یهود بنی عوف أمّة مع المؤمنین للیهود دینهم و للمسلمین دینهم الّا من ظلم واثم فانه لا یوتغ الّا نفسه**

بنی عوف کے یہودی اہل ایمان کے ساتھ ایک امت ہیں یہود کیلئے ان کا دین اور مسلمانوں کیلئے اپنا دین ہے مگر جس نے ظلم اور جرم کیااس نے خود ہی کو ہلاک کیا۔ جہاں تک جماعت مسلمین کا کلمہ ہے یہ کلمہ امت کا ہی ہم معنی ہے مگر مجتمع اسلامی (اسلامی معاشرہ) اسکے معنی میں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی جماعت کا اس نظام حکومت کواپنانا اوراس کوتسلیم کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے حکمت وعدل

(۱) عیون الاثر ابن سید الناس ۱/۱۹۸، مسند احمد شرح البناء ۲۱/۱۰

کے ساتھ وضع کیا ہے یہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ یہ معنی اپنے ضمن میں یوں وسعت رکھتا ہے کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی شامل ہو جاتے ہیں اور جب ایسے نظام اسلامی کو مسلم وغیر مسلم ملکی قانون کے طور پر تسلیم کرتے ہوں تو وہ اسلامی معاشرہ ہی قرار دیا جائے گا یاد رہے کہ وہ اسلامی عقائد جن کے ساتھ انسان مسلمان قرار پاتا ہے وہ اس کے اس عمومی نظام سے مختلف ہیں جن کو تسلیم کرنے سے انسان اسلامی معاشرے کا ایک فرد کہلاتا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام انسان کے دینی عقائد سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے اس کی دینی آزادی کا حق غصب کرتا ہے اگر کوئی غیر مسلم اپنے دینی عقائد پر رہتے ہوئے اسلامی نظام حکومت کے ساتھ مخلص ہے اور وہ اسے ملکی قانون کے طور پر تسلیم کرتا ہے تو وہ اسلامی معاشرے کا ہی ایک فرد قرار دیا جائے گا۔

اسلام کے دو وجود

مذکورہ بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے دو وجود ہیں دینی وجود اور سیاسی وجود دینی اور اعتقادی وجود کا مرکز تو انسان کا ایمان وایقان ہے اور اس کے سیاسی وجود کا مرکز تو اس سرزمین کے اوپر ہے جسے دارالاسلام کا نام دیا گیا ہے جس کا ظہور ان باہمی تعاونی تعلقات ومعاملات میں ہوتا ہے جو وہاں کے باشندوں میں اسلام کے نظام اور ارشاد کے متعلق انجام دئے جا رہے ہیں پھر یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ اسلام کا دینی واعتقادی وجود اسکے سیاسی وجود کو مستلزم ہے کیونکہ جو انسان اسلامی اعتقاد پر ایمان رکھتا ہے وہ یقیناً اسکے فوقانی اور اجتماعی نظام کو بھی تسلیم کرتا ہے مگر اسلام کا سیاسی وجود اس کے دینی واعتقادی وجود کو مستلزم نہیں کیونکہ کوئی بھی انسان

نصرانیت یہودیت یا کوئی بھی مذہب اپنانے کا پورا حق رکھتا ہے جبکہ وہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے نظام اسلامی سے مخلص اور اس سے وفاداری کا جذبہ بھی رکھتا ہو۔ یہاں پر یہ بات بھی واضح ہوئی کہ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کا معنی ایک ہی ہے جو صرف ان مسلمانوں کو شامل ہے جو اسلام کو دین وعقیدے کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جبکہ اسلامی معاشرہ کا لفظ کلمہ امت کا ہم معنی ہے اس کے مطابق وہ ان غیر مسلموں کو بھی شامل ہوگا جو اسلامی معاشرے سے حقیقی طور پر وفادار ہوں گے۔ اور تاریخی ووطنی طور پر وہ اس اسلامی معاشرے سے منسوب رہیں گے۔

نظام حکومت

اسلامی معاشرے اور حکومت میں حقیقۃً اقتدار اور حاکمیت اعلیٰ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کیلئے ہوتی ہے۔ اور لوگ اس امر کے مکلّف ہوتے ہیں کہ وہ خود پر احکام الٰہی کو نافذ العمل کریں تاہم جس اسلامی معاشرہ میں یہ تین عناصر کامل طور پر پائے جائیں اس پر حکومت کے لفظ کا اطلاق اس حقیقت کے متعارض نہیں ہے۔ اس نظام حکومت کی جامع تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر رمضان بوطی شامی لکھتے ہیں بأنّہ مجموعة ضوابط تنسق علاقة الناس بعضهم مع بعض على اختلاف فئاتهم وادیانهم عند ما یعیشون معًا فوق أرض واحدة علیٰ ان تكون هٰذه الضّوابط خاضعة للسّیاسة الاسلامیّة العامة التی یتكوّن منها نظام المجتمعات الاسلامیّة (۱)

---

(۱) الجہاد فی الاسلام ص ۸۸

وہ ایسے قوانین کے مجموعے کا نام ہے جو لوگوں کے جماعتی اور اعتقادی اختلاف کے باوجود ان کے باہمی تعلقات کو منظّم کرتا ہے۔ تاہم ان ضوابط کا اسلامی سیاست کے تابع ہونا ضروری ہے کہ جس سے اسلامی معاشرہ کا نظام معرض وجود میں آتا ہے۔ اسلامی حکومت میں شریعت اسلامیہ کی عملی تطبیق کی ضرورت کے پیش نظر دو پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اعتقادی پہلو اور سیاسی وقضائی پہلو اعتقادی پہلو سے صرف وہ مسلمان مراد ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت محمد ﷺ کی ختم نبوت تمام انسانیت کی طرف آپ کی بعثت اور قرآن حکیم کے کلام اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں یہ طبقہ اس امر کا پابند ہے کہ آپ کے احکام کی اتباع اور آپ کے نظام کو دل وجان سے تسلیم کرلے۔ سیاسی اور قضائی پہلو کے اعتبار سے حاکم اور اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے درمیان عدل وانصاف کے اقرار اور نظام حکومت کو مربوط کرنے کا عملی مظاہرہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس پہلو کو دیکھتے ہوئے ہر شخص اپنے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق حاکم وقت اور سربراہ حکومت کے ساتھ بیعت اور معاہدے کے تحت ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔(۱)

جہاد بالسّیف کا سبب ظلم وتعدّی کو روکنا ہے یا کفر کا خاتمہ

جمہور حنفی مالکی اور حنبلی فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ جہاد قتالی کا سبب اور اسکی اصل علت دار الحرابہ ظلم وعدوان کو روکنا ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اظہر قول کے

---

(۱) الجہاد فی الاسلام ڈاکٹر رمضان بوطی ص ۸۹

مطابق اسکی علت کفر ہے امام ابن حزم الظاہری کا مذہب بھی یہی ہے (۱)

جمہور علماء نے اپنے موقف پر صریح آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے استدلال کیا ہے جن سے صاف طور پر ثابت ہو رہا ہے۔ کہ مسلمانوں کے قتال کی بنیاد ان کے اغیار مخالفین کے ظلم وعدوان کو روکنا ہے۔ ذیل میں چند آیات قرآنی درج کی جا رہی ہیں۔

1: وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الّذین یقاتلونکم ولاتعتدوا ان اللّٰہ لا یحب المعتدین (۲)

اور اللہ کی راہ میں لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ پسند نہیں رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو۔

2: ألا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھمّوا باخراج الرّسول وھم بدء وکم اوّل مرّۃ (۳)

کیا اس قوم سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کے نکالنے کا ارادہ کیا حالانکہ انہیں کی طرف سے پہل ہوئی ہے۔

3: لاینھٰکم اللّٰہ عن الّذین لمَ یقاتلوکم فی الدّین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم انّ اللّٰہ یحب المقسطین ○ انّما ینھٰکم اللّٰہ عن الّذین قاتلوکم فی الدّین واخرجوکم من دیارکم

(۲) بدایۃ المجتہد ابن رشد ۱/۳۶۹، ۳۷۰، المغنی ابن قدامہ ۹/۳۰۱، فتح القدیر ابن ہمام ۵/۴۵۲، شرح صغیر علی اقرب المسالک ۲/۲۷۵، مغنی المحتاج شربینی ۴/۲۲۳، تحفہ ابن حجر ۱/۲۲۱

(۲) بقرہ: ۱۹۰ (۳) التوبہ: ۱۳

وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولّوھم ومن یتولّھم فاولئک ھم الظّٰلمون (۱)

اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو بیشک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔

اللہ تمہیں انہیں سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر مدد کی کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ستمگار ہیں۔

4: وقاتلوا المشرکین کافّة کمایقاتلونکم کافّةً (۲)

اور مشرکوں سے ہر وقت لڑو جیسا کہ وہ تم سے ہر وقت لڑتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے صراحۃً ثابت ہو رہا ہے کہ کفار سے جہاد قتالی کی علت ان کا عدوان اور زیادتی ہے۔

جمہور فقہاء کے موقف پر احادیث شریفہ سے استدلال

عن الحنظلة رضی اللّٰہ عنه قال غزونا مع رسول اللّٰہ ﷺ فمر رنا علیٰ امرأ مقتولة قد اجتمع علیھا النّاس فأفرجوا له فقال ماکانت ھذه تقاتل فیمن یقاتل ثم قال لرجل انطلق الیٰ خالد بن ولید فقل له انّ رسول اللّٰہ ﷺ یامرک لاتقتلنّ ذرّیة ولاعسیفا (۳)

---

(۱) الممتحنہ : ۹/۸ (۲) التوبہ : ۳۶ (۳) ابن ماجہ، ابوداؤد، احمد بن حنبل

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھے کہ ہمارا گذر ایک مقتولہ عورت پر ہوا جس کے گرد لوگ جمع تھے آپ کو دیکھتے ہی وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے تو آپ نے فرمایا یہ عورت تو ان مقاتلین میں شامل نہ تھی پھر آپ نے ایک شخص سے کہا کہ جاؤ اور خالد بن ولید سے کہہ دو کہ رسول اللہ کا حکم ہے کہ عورتوں اور مزدوروں کو مت قتل کرو۔

عن أنس بن مالک رضی اللّٰہ عنہ انّ رسول اللّٰہ ﷺ قال انطلقوا باسم اللّٰہ ولاتقتلوا ثینما فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امرأۃ ولا تغلوا وضمّوا غنائمکم وأصلحوا واحسنوا ان اللّٰہ یحب المحسنین (۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ روانہ ہو جاؤ مگر عمر رسیدہ بوڑھے اور چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا خیانت نہ کرنا مال غنیمت کو اکٹھا کرنا اصلاح اور درستگی سے کام لینا اور احسان کرنا اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس مقام پر ڈاکٹر محمد سعید بوطی شامی دامت برکاتہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اظہر قول کے دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

وعدنا الی الادّلۃ التی اعتمد علیھا الجمھور من القرآن والسنّۃ فتأ ملنا فیھا مرّ ۃ أخریٰ علمنا أن الحق ما ذھب الیہ الجمھور من انّ الکفر یعالج بالدعوۃ والتبلیغ والحوار وانّ الحرابۃ تعالَج

---

(۱) نصب الرایہ: ۳۸۶/۳

بالقتال ومامن آیة نزلت فی الجهاد القتالی الّا وتری فیها أو فی الآیات التی تحیط بها من قبل أو من بعد ما یبرز هذه العلّة للقتال الا وهی الحرابة أو القصد والتوثّب للحرابه والقتال ...(۱)

اس مسئلہ پر جمہور علماء نے قرآن وسنت سے جو دلائل پیش کئے ہیں ان پر غور وتأمل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہی موقف حق ہے کہ کفر کا علاج تبلیغ دعوت الی الحق اور مکالمہ سے کیا جائے۔

اور تعدّی وزیادتی کا مقابلہ قتال سے کیا جائے کیونکہ جو آیت کریمہ بھی جہاد قتالی کے متعلق نازل ہوئی اس کے تحقیقی جائزے سے قتال کی علت حرابہ وعدوان یا اس کا عملی ارادہ ہی نظر آتا ہے۔

جہاد قتالی کا اعلان احکام امامت سے متعلق ہے۔

شریعت اسلامیہ کے احکام دو قسم کے ہیں احکام تبلیغ اور احکام امامت احکام تبلیغ وہ ہیں جن سے براہ راست ہر فرد مخاطب ہے اور ان کے نفاذ اور تطبیق میں وہ کسی قاضی یا امام کی وساطت کا محتاج ومنتظر نہیں جملہ عبادات ومعاملات اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر احکام امامت سے صرف امراء اور آئمہ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہے ان امۃ م کے پہلے مخاطب رسول اللہ ﷺ تھے پھر آپ کے بعد یہ سلسلہ آپ کے خلفاء کرام تک پہنچا چنانچہ اب قیامت تک جو بھی ملت اسلامیہ کا امام وامیر ہوگا وہ اس بات

(۱) الجہاد فی الاسلام ص ۱۰۶

کا ذمہ دار ہے کہ وہ ان احکام کی تنفیذ و اجراء میں حسب مصلحت اقدام کرتا رہے۔

جب جہاد اپنی تمام حکمت وسیاست کے ساتھ احکام امارت سے وابستہ ہے

تو امیر و حاکم کے اذن و مشورے کے بغیر کسی فرد کو بھی اس کی زمام کار اپنے ہاتھ میں

لینے کا اختیار نہیں اس موضوع پر تفصیلی اور مضبوط تبصرہ ملاحظہ کرنا ہو تو امام القرافی کی

کتاب **احکام فی تمییز الفتاوی عن الاحکام و تصرّفات القاضی**

والامام کا مطالعہ انتہائی مفید رہے گا۔

اس مقام پر اس بات کو واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ دعوت الی الحق اور لسانی

جہاد کے بعد جب مسلح مقابلہ شروع ہوتا ہے تو یہ جہاد اس قتال سے الگ حیثیت

رکھتا ہے۔ جو ایک حملہ آور کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی لئے فقہاء کرام نے اپنی

تصانیف میں دو مختلف باب رکھے ہیں باب الجہاد اور باب الصّیال۔ صیال کا معنی و

مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص یا کوئی جماعت کسی انسان کی زندگی یا اس کے مال یا اسکی

عزت پر حملہ آور ہو تو اللہ تعالیٰ اس انسان کو اپنی حیات اور مال و عزت کے دفاع کا پورا

حق دیتا ہے۔ مگر اس حملہ آور کے ساتھ قتال کرنا احکام تبلیغ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ احکام

امارت سے اس کی اساس اور بنیاد اس حدیث پر ہے **من قتل دون مالہ فھو**

شھید ومن قتل دون دمہ فھو شھید ومن قتل دون دینہ فھو شھید (۱)

جو شخص اپنے مال اپنی جان اور اپنے دین کو بچانے کی خاطر قتل ہوا وہ شہید ہے۔

اس باب میں وہ یلغار عام بھی شامل ہے کہ جب کوئی دشمن مسلمانوں کے

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد

کسی شہر پر ان کی زندگی یا ان کی عزت یا ان کے مال کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے حملہ آور ہوتا ہے تو اس وقت حاکم وقت سے لیکر عامۃ النّاس پر واجب ہے کہ وہ اس عدوان اور حملے کو روکنے اور مفسدین کا منہ توڑ جواب دینے کی خاطر ہر ممکن اقدام کریں ایسے حالات میں دفاع اور قتال کیلئے امیر المومنین سے اجازت لینے یا خود اس کی طرف سے ان حملہ آوروں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کی کوئی قید نہیں۔ اس مقالہ میں ہم اس یلغار عام کی بات نہیں کر رہے جو باب الصّیال میں داخل ہے اگر چہ جہاد کا عمومی معنی اسے بھی شامل ہے اور اس پر بھی جہاد کے تمام احکام منطبق ہوتے ہیں بلکہ ہم اس جہاد قتالی کی بات کرنا چاہتے ہیں جو فرض کفایہ کے طور پر ہر ہر فرد پر نہیں بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت پر فرض ہے۔

چنانچہ جہاد فرض کفایہ اسلامی وطن کی سرحدوں اور اسکی املاک کی حفاظت کیلئے ہوتا ہے اور کبھی مسلمانوں کو دعوت حق کی تبلیغ اور اسلام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے سے منع کرنے والوں سے قتال کے ساتھ اور کبھی اسلامی شہر کے باہر اس پر حملہ آوروں سے مقابلہ کے ساتھ جیسا کہ جنگ احد جنگ بدر اور جنگ ذات الرّقاع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ قتال کیا اور کبھی اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہونے والی کسی خفیہ تدبیر کے انکشاف پر ان کے شہروں پر دھاوا بولنے اور ان سے جنگ اور جدال کے ساتھ یہ تمام صورتیں جہاد کفائی میں شامل کی جاتی ہیں۔ اور ان کیلئے امام المسلمین کی قیادت واجازت ضروری قرار دی گئی ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

أمر الجهاد موكول الى الامام اجتهاده ويلزم الرّعية فيما

یراہ من ذالک (۱)

جہاد کا معاملہ امام اور امیر کے سپرد کیا گیا ہے رعیت پر اس کے فیصلے کی پابندی لازم ہے

دور حاضر میں شرعی جہاد کی حقیقت اور اسکی عصری تطبیقات وتفصیلات جاننے

کیلئے ڈاکٹر محمد خیر ہیکل کی تین مجلدات پر مشتمل کتاب الجهاد و القتال فی

السياسية الشرعية دارالبیارق بیروت لبنان اور ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی شامی

کی کتاب الجهاد فی الاسلام کیف نفهمه و کیف نمارسه طبعہ دارالفکر

بیروت کا مطالعہ انتہائی مفید رہے گا

عبدالرسول منصور الازہری

31 جنوری 2004ء

المغنی ابن قدامہ : ۹/ ۲۸۴

ایمان
میں کمی وبیشی
پر تحقیقی مؤقف
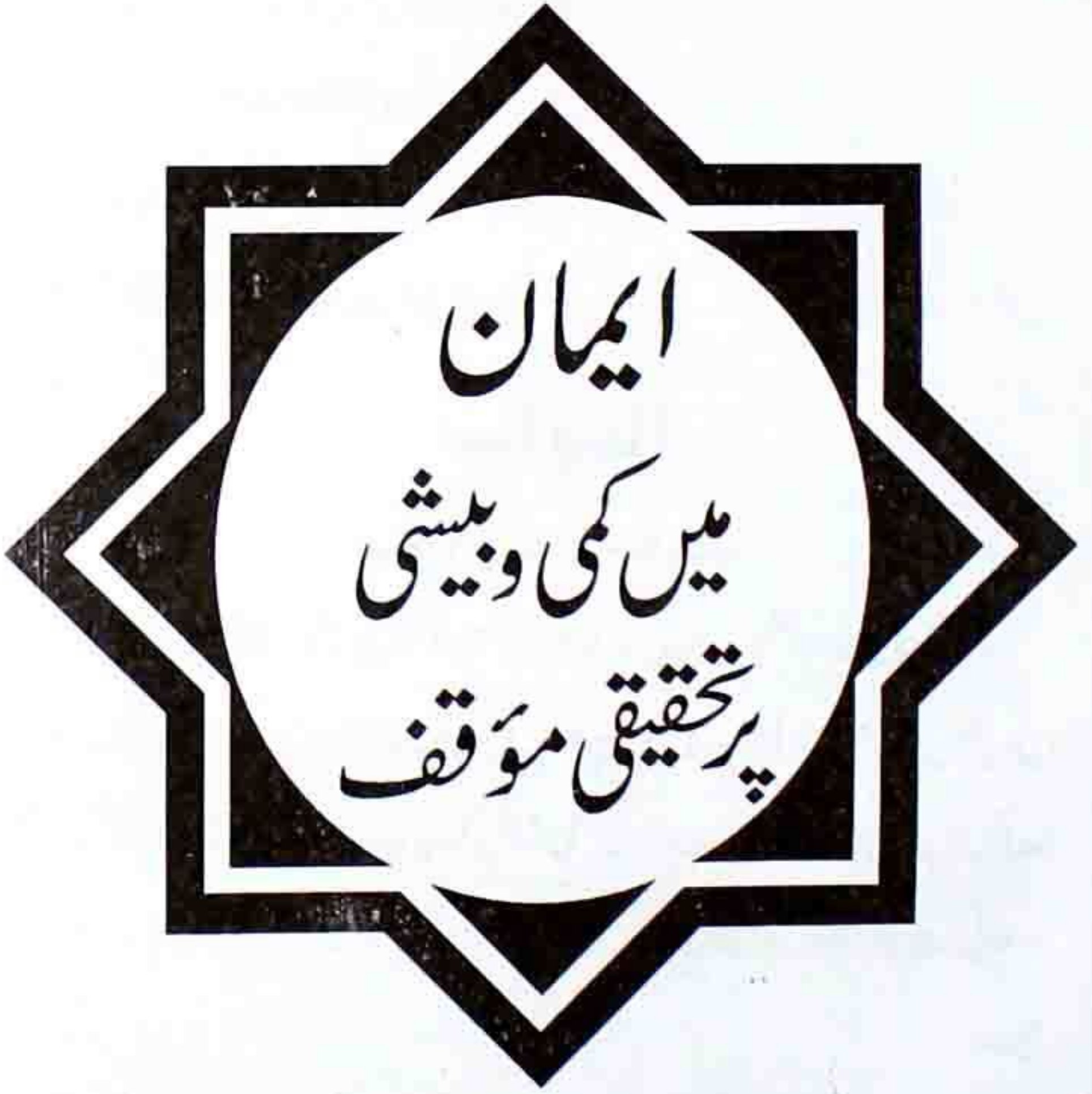
حضرت قبلہ مفتی الازھری زید مجدک ایمان اور اسکے بڑھنے اور گھٹنے کے

مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون کریں۔اور عنداللہ ماجور ہوں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔۔

استفتاء از برادر کریم

الحافظ منیر احمد صابر ازہری

وو سٹر ٹاؤن برطانیہ 8 جولائی 2004ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابوالحسن اشعری رضی اللہ عنہما کے موقف پر ایمان محض تصدیق اور ایقان کا نام ہے اندریں حالت ایمان میں کمی وبیشی نہیں ہوتی اور اگر اس میں اعمال وطاعاتِ حسنہ کو بھی شامل کرلیا جائے تو ایمان میں کمی بیشی واقع ہوجاتی ہے پھر اعمال کو ایمان کے مسمّی اور ذات میں شامل کرنے میں چار احتمالات ہیں۔

1۔ اعمال کو ایمان کے مفہوم میں بایں طور رکھا جائے کہ وہ اس کے اجزاء مقومہ قرار پائیں کہ ان کے خاتمہ سے ایمان کا بھی خاتمہ اور عدم ہوجائے جیسا کہ معتزلہ کا موقف ہے۔ وہ عاصی اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از ایمان قرار دیتے ہیں جبکہ اسلاف اور احناف کا یہ مسلک نہیں ان حضرات کے نزدیک اگرچہ ایمان تصدیق کا

نام ہے مگراس کے ساتھ ساتھ حد امکان میں جب تک اس کا نطق اورزبان سے اقرار نہ ہووہ ایمان معتبر نہیں ہوتا اوراس نطق واقرار پر یہ حضرات اس کا نام ایمان اوراس وصف سے متصف کو مومن تسلیم کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ نماز زکوۃ اورحج روزے کا تارک بھی ہو

2۔ اعمال کوایسے اجزاء میں رکھا جائے جوایمان کے مفہوم میں داخل ہوں مگران کے عدم سے ایمان کا عدم لازم نہ آتا ہو کیونکہ اجزاء کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ان کے عدم سے ذات کا عدم لازم نہیں آتا جیسے بال ہاتھ اور پاؤں کے عدم کے باوجود بھی انسان کا عدم ثابت نہیں ہوتا اسی طرح درخت کی شاخوں کے نہ ہونے پر بھی اصل درخت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس پراس حالت میں بھی درخت کا اطلاق کیا جاتا ہے اسلاف کرام کا بھی یہی موقف ہے۔

ان کا قول ہے کہ جس طرح درخت کی شاخیں ہیں اسی طرح ایمان کے بھی شعبے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ کے ساتھ دی ہے۔

3۔ اعمال کوان آثار کے طور پر لیا جائے جوایمان سے تو خارج ہیں لیکن ایمان کے سبب سے ہی ان کا وجود ہے اورمجازاًان پر ایمان کا اطلاق ہو رہا ہے جیسے کبھی کبھار سبب کا اطلاق مسبب پر کرلیا جاتا ہے یہ اخلاف اورمتاخرین کا مذہب ہے۔

4۔ اعمال کلی طور پرایمان سے خارج ہیں اوران پر حقیقۃً اور نہ ہی مجازاً ایمان کا اطلاق کیا جاتا ہے یہ احتمال تو قطعی طور پر باطل وفاسد ہے۔

احتمال نمبر2: جسے مذہب اسلاف کہا گیا ہے اس کے قائل یہ آئمہ اسلام ہیں امام شافعی ،امام مالک ،امام احمد بن حنبل ،امام بخاری اور اشاعرہ میں شیخ ابو العباس

القلانسی، استاذ ابو منصور بغدادی، استاذ ابو القاسم القشیری رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب حضرات ایمان مین کمی اور زیادتی کے موقف پر قائم ہیں۔

جن حضرات سے ایمان کی کمی و بیشی بمعنی تجزّی (اجزاء کے اعتبار سے تقسیم ہونا) منقول ہے انکے اسماء گرامی یہ ہیں۔

سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، معمر بن راشد، ابن جریج الحسن، نخعی، عطا، طاؤس، مجاہد ابن مبارک اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین،

امام تاج الدین عبد الوہاب السّبکی کا موقف

امام تاج الدین سبکی رحمہ اللہ متوفی ۷۷۱ھ شافعیہ کا موقف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک معقول تعداد کا موقف یہی ہے کہ ایمان کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کا یہ قول بھی ہے کہ ایمان تصدیق وایقان کا نام ہے۔

یہ موقف انہوں نے اس لئے اپنایا ہے کہ وہ سلف اور شیخ ابو الحسن اشعری کے موقف کو جمع اور اس میں تطبیق پیدا کرسکیں ان حضرات کا قول ہے کہ سلف ایمان کی تجزی کے قائل ہیں مگر وہ اس کو تصدیق ماننے سے انکار نہیں کرتے اور شیخ ابو الحسن اشعری اس کو تصدیق مانتے ہیں مگر وہ اسکی تجزی کے صحیح ہونے کا انکار نہیں کرتے اور ہم ان دونوں امروں کے جمع کے قائل ہیں بلکہ متکلمین اشاعرہ سے امام الآمدی رحمہ اللہ نے تو اپنی کتاب الابکار میں شیخ ابو الحسن رحمہ اللہ کا موقف بیان کرنے کے بعد اس امر کی تصریح فرمادی ہے

آپ فرماتے ہیں ومن فسّره يعنى الايمان بخصلة واحدة فانه يكون ايضاً قابلاً للزيادة والنقص ...(۱)

جو ایمان کی تفسیر ایک شعبے اور خصلت سے کرتا ہے وہ بھی اسے زیادتی اور نقص کے قابل مانتا ہے۔

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ کا موقف

حضرت امام نووی شافعی اس مسئلہ پر شرح مسلم شریف میں رقمطراز ہیں۔

قال المحققون من اصحابنا المتكلمين نفس التصديق لايزيد ولا ينقص والايمان الشرعى يزيدوينقص بزيادة ثمراته وهى الاعمال ونقصانها (۲)

ہمارے متکلّمین سے محقق حضرات کا قول یہ ہے کہ نفس تصدیق کے اندر تو کمی اور بیشی نہیں ہوتی البتہ شرعی ایمان اپنے ثمرات یعنی اعمال کی کمی اور نقصان سے گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو کثرتِ نظر اور دلائل کے ظہور اور قوت سے نفسِ تصدیق میں بھی زیادتی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صدیقین کا ایمان غیر صدیقین کے ایمان سے کہیں زیادہ اقویٰ ہوتا ہے کیونکہ ان کے ایمان میں کوئی شبہ آڑے نہیں آتا اور نہ ہی کسی عارض سے ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے بلکہ اختلافِ احوال کے باوجود ان کے قلوب منشرح اور

---

(۱) طبقات الشافعیہ الکبریٰ امام تاج الدین سبکی ج: ۱ ص: ۹۹ (۲) شرح مسلم امام نووی ۱/۱۴۸

پرنور رہتے ہیں جبکہ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی اس امر کا کوئی انکار نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس میں کوئی عاقل شک کرسکتا ہے کہ نفس تصدیق میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مساوی کسی بھی دوسرے شخص کی تصدیق نہیں ہوسکتی اسی لئے امام بخاری صحیح بخاری میں حضرت ابن ابوملیکہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں

ادرکت ثلاثین من اصحاب النبی ﷺ کلھم یخاف النفاق علی نفسه ما فیھم احد یقول انه علی ایمان جبریل و میکائیل (۱)

مجھے تیس صحابہ کرام سے ملاقات کا شرف ملا جن میں ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا خوف طاری رہتا تھا۔ اوران سے کوئی بھی یہ نہ کہتا تھا کہ اس کا ایمان جبرائیل و میکائیل کے ایمان کے مطابق ہے۔

اور یہی بات متاخرین متکلمین اشاعرہ سے شیخ صفی الدین ھندی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے وہ فرماتے ہیں

بان الحق انه قابل للزیادة و النقصان مطلقا (۲)

حق بات تو یہ ہے کہ ایمان مطلقاً نفسِ تصدیق ہو یا اعمال و طاعت، وہ کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔

حتی کہ خود شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کی اپنی کتاب الابانہ میں یہ عبارت بڑی صراحت کے ساتھ موجود ہے اور اسے امام ابوالقاسم ابن عساکر شامی نے بھی تبیین کذب المفتری میں نقل کیا ہے۔

---

(۱) شرح مسلم نووی رحمہ اللہ، طبقات الشافعیہ السبکی ج ۱ ص ۱۰۰

(۲) الزبدہ امام الہندی، مقدمہ طبقات شافعیہ ج :۱ ص:۱۰۰

شیخ اشعری فرماتے ہیں

وان الایمان قول و عمل یزید و ینقص (۱)

ایمان قول وعمل کا نام ہے جس میں زیادتی اور کمی ہوتی رہتی ہے۔

مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو عقیدہ طحاویہ (۲)

وصلی اللہ تعالی علی رسولہ خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وبارک وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

ریڈنگ (برطانیہ)

8 جولائی 2004ء

---

(۱) طبقات الشافعیہ الکبریٰ امام تاج الدین سبکی ج:۱ص:۱۰۰

(۲) شرح عقیدہ طحاویہ امام عبدالغنی دمشقی متوفی ۱۲۹۸ھ

نماز کو قصداً اور
تکاسلاً ترک کرنے
سے اس کی قضاء کا مسئلہ
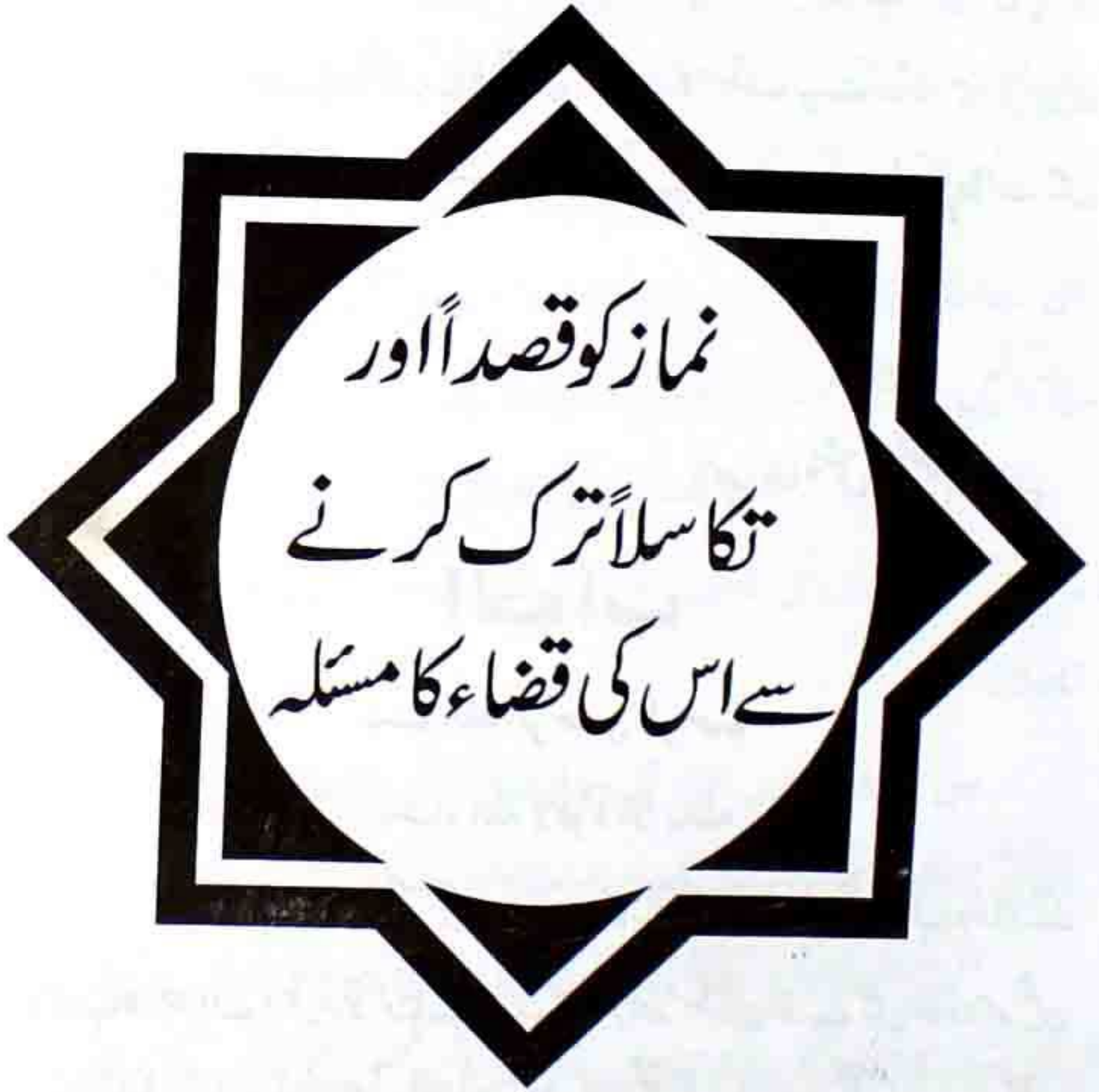
حضرت ازہری صاحب ایک استفتاء پیش خدمت ہے اس پر شرعی حکم ظاہر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں اگر کوئی مکلّف مسلمان قصداً اور تکاسلاً نماز کو ترک کر دے اور اس کا وقت بھی نکل جائے جبکہ وہ نماز کے وجوب کا معترف ہے تو کیا اس پر اس نماز کی قضاء واجب ہے یا نہیں کیونکہ بعض حضرات کا موقف یہ ہے کہ نماز نیند یا نسیان کی صورت میں چلی جائے تو قضاء واجب ہوتی ہے عمداً ترک کرنے کی حالت میں قضاء واجب نہیں۔

استفتاء از

امجد رضا چشتی برمنگھم برطانیہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَاشَاءَ اللّٰہ لاقُوَّةَ اِلا باللّٰہ

جو شخص جان بوجھ کر سستی کی وجہ سے نماز کو ترک کرتا ہے جب کہ وہ نماز کے وجوب کا اعتراف و اقرار تو کرتا ہے اس کے کافر اور مسلمان ہونے میں علماء و محدثین نے اختلاف کیا ہے اور کیا اسے کفر اور حد کی بناء پر قتل کیا جائے یا نہ قتل کیا جائے بعض علماء کا مذہب ہے کہ وہ عمداً اور تکاسلاً ترک صلوٰۃ سے کافر اور مرتد ہو جاتا ہے اسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے اگر وہ توبہ کر لے تو فبھا ورنہ اسے کفر کی وجہ سے قتل کر دیا جائے یہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضرت علی المرتضیٰ، ابن مبارک، اسحاق بن

راہویہ، منصور الفقیہ الشافعی، ابو الطیّب بن مسلمہ رضی اللہ عنھم سے بھی یہ قول مروی ہے

ان حضرات کے کچھ دلائل درج ذیل ہیں ارشاد ربانی ہے

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم (۱)

''پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے بھائی ہیں''

آیہ کریمہ کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے کہ نماز قائم نہ کرنے کی صورت میں وہ اہل ایمان کے بھائی نہیں ہوں گے اور جب ان سے اخوت مؤمنین ختم ہوگئی تو وہ کفار قرار دیئے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے

انما المؤمنون اخوۃ (۲)

2۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کا یہ ارشاد سنا۔

بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاۃ (۳)

''مرد اور اسکے کفر وشرک کے درمیان نماز کو ترک کرنا حد فاصل ہے۔''

اس فرمان رسول ﷺ سے واضح ہوتا ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے کیونکہ اس میں شرک کا عطف کفر پر ڈالا جا رہا ہے جس میں ایسے شخص کے کافر ہونے کی قوی تاکید نظر آرہی ہے۔

3۔ حضرت عباہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے اُمراء

---

(۱) التوبہ:۱۱ (۲) الحجرات:۱۰ (۳) صحیح مسلم ح:۱۳۴ کتاب الامارۃ

کیلئے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کہ ہم ہر حال میں ان کی اطاعت کریں گے اور ان سے تنازع نہیں کریں گے مگر اس کے ساتھ ہی آپ نے ارشاد فرمایا

الا ان تروا کفرا بواحا عندکم فیه من الله برهان (۱)

''ہاں اگر تم اعلانیہ کفر دیکھو تو تمہارے لئے اندریں حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلیل ہوگی۔''

چنانچہ بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکِ صلوٰۃ کھلم کھلا کفر ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان قائم ہے۔

4۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی روایت منقول ہے جس میں ترکِ صلوٰۃ کی حالت میں امراء و حکام سے قتال کی اجازت دی گئی ہے (۲)

5۔ حضرت بریدہ بن حصیب الاسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

سمعت رسول الله ﷺ العهد الذی بیننا وبینهم الصلاة فمن ترکها فقد کفر (۳)

''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے جس نے اسے چھوڑا وہ کافر ہوا۔''

دوسرا موقف

اہل علم کی دوسری جماعت جس میں حضرت امام ابوحنیفہ آپ کے اصحاب اور اہل کوفہ سے امام سفیان ثوری، صاحب الشافعی امام المزنی رضی اللہ عنہم شامل ہیں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الفتن ۷۰۵۵ (۲) صحیح مسلم کتاب الامارۃ ۶۵

(۳) المسند ۳۴۶/۵، المستدرک کتاب الایمان ۶/۱

ان کا مذہب یہ ہے کہ عمداً تکاسلاً تارکِ صلوٰۃ مگر اسکے وجوب کا اعتراف کرنے والا کافر نہیں اور نہ ہی واجب القتل ہے بلکہ قابل تعزیر ہے اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ وہ نماز قائم کرنے لگے ان حضرات کے کچھ دلائل درج ذیل ہیں۔

1۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشاء (۱)

2۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کا یہ فرمان سنا۔

ان اول مایحاسب بہ العبد یوم القیامۃ الصلاۃ المکتوبۃ فان اتمھا والا قیل انظروا ھل لہ من تطوّع فان کان لہ تطوع اکملت لفریضۃ من تطوعہ ثم یفعل بسائر الاعمال المفروضۃ مثل ذالک. (۲)

''قیامت کے روز سب سے پہلے بندے کا محاسبہ فرض نماز کے ساتھ کیا جائے گا اگر اس نے اسے مکمل کیا ہوگا تو فبھا ورنہ حکم ہوگا اسکی نفلی نماز کو دیکھو اگر نفلی نماز ہوگی تو اس اسے سے فرضی نماز کو مکمل کیا جائے گا پھر تمام اعمال فرضی کے ساتھ یہی انداز اپنایا جائے گا۔''

اس حدیث مبارک سے ثابت ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ کافر نہیں کیونکہ فرضی نمازوں کا نقصان اور پھر ان کا اتمام نوافل سے اپنے عموم کے ساتھ بعض نمازوں کے

---

(۱) النساء: ۱۱۴ (۲) ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ۸۶۴، الترمذی کتاب الصلوٰۃ ۴۱۳

عمداً ترک کو بھی شامل ہے۔

2۔ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

لا یحل دم امرىء مسلم يشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ﷺ الا باحدى ثلث الثيب الزانى والنفس بالنفس والتارک لدينه المفارق للجماعة (۱)

اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے والے مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر ان تین میں سے کسی ایک صورت میں شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان اور اپنے دین اور جماعت مسلمین کو چھوڑ دینے والا مرتد۔

اس صریح اور متفق علیہ حدیث میں مذکورہ تین چیزوں سے خون مسلم حلال ہو جاتا ہے جبکہ اس میں ترکِ صلوٰۃ کا ذکر نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ ترکِ صلوٰۃ قتل کا باعث نہیں ہے۔

حنفیہ کی طرف سے ترکِ صلوٰۃ پر جن احادیث میں کفر کا لفظ وارد ہوا ہے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ وہ کفر نہیں جو مسلمان کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے بلکہ اس سے کفر نعمت مراد ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ شخص کفر کی حد کے قریب ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

سباب المسلم فسوق وقتاله كفر (۲)

"مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے"

---

(۱) بخاری کتاب العلم :۱۲۸، مسلم کتاب الایمان ۵۳ (۲) بخاری کتاب الایمان :۴۸، مسلم کتاب الایمان :۱۱۶

اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

لیس من رجل ادعی لغیر ابیه وهو یعلمه الا کفر (۱)

”جس مرد نے اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کا دعوی کیا اس نے کفر کیا“

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

اثنتان هما بهم کفر الطعن فی النسب والنیاحة علی المیت (۲)

”لوگوں میں دو چیزیں کفر ہیں نسب میں طعن و تشنیع کرنا اور مردے پر نوحہ گری کرنا“

امام ابن حنبل رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ سید عالم ﷺ کا ارشاد ہے

من حلف بشیء دون الله فقد أشرک (۳)

”جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ قسم کھائی اس نے شرک کیا۔“

عمداً ترکِ صلوٰۃ مگر اعتراف وجوب کے مسئلہ پر اہل علم کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا شخص کافر گو ہے مگر جمہور علماء کے قول کے مطابق اس کا یہ کفر اسے ملت اسلامیہ سے خارج نہیں کرے گا۔ اور جب کفر اور شرک سے یہ معنی مراد لیا جائے تو دونوں اطراف سے پیش کئے جانے والے دلائل میں جمع اور تطبیق ہو جاتی ہے اور جب

---

(۱) بخاری المناقب: ۳۵۰۸، مسلم الایمان: ۱۱۲ (۲) مسند احمد: ۲/۳۷۷ (۳) مسند احمد: ۱/۴۷/۲/۳۴

دو دلیلوں میں جمع ممکن ہو تو جمع واجب ہو جاتی ہے کیونکہ دونوں دلیلوں پر عمل پیرا ہونا ان سے کسی ایک کے الغاء اور ترک کرنے سے اولیٰ وافضل ہوتا ہے جیسا کہ علم الاصول اور علم الحدیث میں اس مسئلہ کی تفصیل مرقوم ہے شارح مسلم حضرت امام نووی شافعی رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا شخص کافر نہیں ہے کیونکہ ہر دور میں مسلمان تارکِ صلوٰۃ کو وارث بناتے اور اس کا وارث بنتے رہے ہیں۔ اور اگر وہ کافر اور ناقابل مغفرت ہوتا تو وہ خود وارث بنتا اور نہ ہی کسی کو اپنا وارث بناتا۔(۱)

عمداً ترکِ صلوٰۃ پر اسکی قضاء کا شرعی حکم

جو شخص عمداً نماز کو کاہلی وسستی کی بناء پر ترک کرے اور اس کا وقت مخصوص بھی نکل جائے جبکہ وہ اس کے وجوب کا معترف ہے تو کیا اس پر اسکی قضاء واجب ہے یا نہیں اس مسئلہ پر علماء نے اختلاف کیا ہے جمہور علماء کرام جن کے نزدیک ایسا شخص کافر نہیں ہے ان کا موقف بیان کرتے ہوئے امام ابوبکر الرازی الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ان الامر بالعبادة الموقتة يستلزم الامر بقضائها بعد خروج الوقت من غير احتياج الى امر جديد واستدلوا بقاعدة هى قولهم الامر بالمركب امر بكل جزء من اجزاء ه فاذا تعذر بعض الاجزاء

---

(۱) اضواء القرآن ج ۴ ص ۲۴۴

لزم فعل بعضها الذی لم یتعذر (۱)

وہ عبادت جو وقت کے ساتھ متعین کی گئی ہے اس پر وارد ہونے والا امر وقت کے نکل جانے کے بعد بھی اسکی قضاء کو مستلزم ہوگا اور اسکی قضاء کیلئے کسی نئے امر کی محتاجی نہ ہوگی ان حضرات نے اپنے اس قاعدے سے استدلال کیا ہے کہ جو امر کسی مرکب پر آتا ہے وہ اسکے اجزاء سے ہر ہر جزء کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ اس کے بعض اجزاء سے متعذر ہو جانے پر باقی ماندہ غیر متعذر اجزاء پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ چنانچہ پانچ نمازوں پر آنے والا امر دو چیزوں سے مرکب ہے

1۔ فعل عبادت

2۔ ان نمازوں کا وقت معین کے ساتھ اقتران۔

تو وقت معین کے نکل جانے پر ایک جزء متعذر ہوئی یعنی وقت معیّن سے اقتران مگر دوسری جزء یعنی فعل عبادت تو غیر متعذر اور باقی ہے اندریں صورت پہلے امر سے ہی اس غیر متعذر اور مقدور بھر جزء پر عمل کرنا لازم ہوگا کیونکہ امر بالمرکب اپنے اجزاء کے ساتھ امر ہوتا ہے۔

ابن قدامہ نے روضۃ الناظر اور امام غزالی نے المستصفٰی میں بھی یہ قول نقل کیا ہے۔

دوسری دلیل

عمداً ترکِ صلوٰۃ کی قضاء پر دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ عامد کو ناسی اور نائم پر قیاس کیا گیا ہے جب نیند اور نسیان کی صورت میں قضاء پر نص وارد ہوئی ہے تو عمداً

(۱) اضواء القرآن: ج ۴ ص ۲۵۱

ترکِ صلوٰۃ کو بھی اس پر قیاس کیا گیا ہے امام نووی شافعی رحمہ اللہ نے شرح المھذب میں اس مسئلہ پر حدیث ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آپ ﷺ نے دن میں بیوی سے جماع کرنے والے کو کفارے کے ساتھ اس دن کے روزے کی قضاء کا حکم بھی دیا جس دن اس نے عمداً جماع کے ساتھ اسے فاسد کردیا تھا۔(۱)

تیسری دلیل

عمداً ترکِ صلوٰۃ کے وجوب قضاء پر اس صحیح حدیث کے عموم سے بھی استدلال کیا گیا ہے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

فدين الله احق ان يقضى

اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسکی قضاء کی جائے۔

اس فرمان رسول ﷺ میں دین اللہ اسم جنس ہے جس میں عمداً ترکِ صلوٰۃ کا دَین بھی شامل ہے جو اہل علم ترکِ صلوٰۃ عمداً کی قضاء کے قائل نہیں ان میں امام ابن حزم اور شیخ ابن تیمیہ دمشقی کا نام سرفہرست ہے ان کے نزدیک چونکہ قضاء کے لئے جدید امر نہیں آیا اس لئے عمداً ترکِ صلوٰۃ کی قضاء نہیں ہوگی۔(۲)

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه وسلم

عبدالرسول منصور الازہری

4 اگست 2004ء

(۱) سنن کبریٰ امام بیہقی کتاب الصیام ۲۲۶/۴، سنن ابی داؤد کتاب الصیام حدیث ۲۳۹۳ (۲) اضواء القرآن ج ۳۵۳/۴

علامہ مفتی
عبدالرسول منصور الازہری
کی دیگر تالیفات
فتاویٰ منصوریہ
مبلغ اسلام، شیخ القرآن والحدیث حضرت
علامہ الحاج مفتی عبدالرسول منصور الازہری دامت برکاتہم العالیہ
کی فقہی بصیرت اور تحقیقی مہارت کا شاہکار ہے۔ علامہ صاحب
برطانیہ کی مسلم کمیونٹی کے عائلی و مذہبی مسائل کے حل کے لئے قائم کردہ
شرعی کونسل کے چیئر مین ہیں اپنی اس حیثیت میں آپ سائلین کے استفتاءات
کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ فتاویٰ منصوریہ آپ کے انہی فتاویٰ جات کا مجموعہ ہے
جن میں سے بعض کافی مفصل ہیں۔ ان فتاویٰ میں آپ نے بعض مسائل
عصریہ کا مجتہدانہ حل بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے
ہی آپ اندازہ کرسکیں گے کہ یہ اہل علم دانش کے لئے کس قدر مثالی
اثاثہ ہے۔
محمد منور نورانی
رؤیت ہلال
تفسیر بیضاوی
الآداب
اردو ترجمہ
مقالات منصور
حصہ اول
عصمت انبیاء
اردو ترجمہ
وادیٔ نیل
آئینہ میں جمال مصطفیٰ ﷺ
فلسفۂ موت و حیات
اذان سے قبل درود و سلام
بستان العارفین
غیر اسلامی ممالک اور شرعی قضاء
ناشر مکتبہ مصباح القرآن ساہیوال